JULY
2024

جدید ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

فلسطین

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو

غزل

[مختار صدیقی علیہ رحمہ کے لیے]

کارِ اندوہ ، تہِ کار سبو ہوتا ہے
موج فرما ، مرے شیشے میں بھی تو ہوتا ہے

شمع پیوندِ زمیں ہو تو دیئے جلتے ہیں
خاک کا زخم بھی مٹی سے رفو ہوتا ہے

اشک پگھلے ہوئے لوہے کی طرح بہتے ہیں
اہلِ غم کا اسی جھلمل سے وضو ہوتا ہے

درد کونجوں کی طرح محوِ سفر رہتے ہیں
ختم اے جاں ! سفرِ عشق ، کبھو ہوتا ہے؟

چادرِ ریگِ رواں ، چادرِ آہن تو نہیں
دھول کا پھول بھی غماز نمو ہوتا ہے

پردۂ رمز ہٹا ، ابرِ کنایہ سے نکل
یار خالد ، کبھی پانی بھی لہو ہوتا ہے!

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 32 - جولائی 2024 - شمارہ نمبر: 7

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: **فلسطین نمبر**

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور
A/c Title Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700
فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517
Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر زد فاریہ سٹو دنزل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	خاور اعجاز	7
2	نعتؐ	جلیل عالی، نسیم سحر، سید ریاض حسین زیدی، اعجاز کنور راجہ، احمد جلیل، نبیل احمد نبیل، بشیر احمد حبیب	8 تا 14
3	عقیدت	اکرم ناصر، رضا اللہ حیدر، افروز رضوی، مرزا آصف رسول، نوید عاجز، صغیر احمد صغیر	15 تا 20
4	رباعیات	گلزار بخاری	21
5	قطعات	اجمل اعجاز	22
6	گیت	خاور اعجاز	23
7	مضامین	خواجہ محمد زکریا، محمد ارشاد، حنیف باوا، خاور اعجاز، نسیم سحر، حامد یزدانی، علی دانش، آصف علی چٹھہ، صبیح رحمانی، سیما پیروز، رزاق شاہد، نصرت نسیم، ظفر اقبال ظفر، شاعر علی شاعر، شاہد فرید، گلناز کوثر، رانا محمد شاہد، صدام ساگر	24 تا 96
8	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	97 تا 105

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، نسیم سحر، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری گلزار بخاری، یعقوب پرواز، خالد علیم، راحت سرحدی شاہین عباس، اقبال سروبہ، اسلام عظمی، شاہد اشرف، عقیل رحمانی اکرم ناصر، احمد جلیل، افروز رضوی، مظہر امام، محمد شفیق انصاری شوکت محمود شوکت، اعجاز روشن، رخشندہ نوید، طلعت شبیر اعجاز دانش، رضا اللہ حیدر، افتخار شوکت، انصر حسن سرور حسین نقشبندی، نائلہ راٹھور، رابعہ عبدالقیوم، آصف شفیع اصغر علی بلوچ، فیض رسول فیضان، آفتاب خان، شاہد فرید ثمینہ سید، صغیر احمد صغیر، اکرم جاذب، شاکر خان بلوچ سرور فرحان، مسعود تنہا، نبیل احمد نبیل، عطاالعزیز، اسد رضا سحر زبیر خیالی، محمد ادریس قریشی، انجم عثمان، محمد اشفاق بیگ ریاض ندیم نیازی، محسن جائی، اکمل حنیف، عاصم بخاری، افضل ہزاروی محمد نور آسی، عابد رضا، نادیہ سحر، عباس علی شاہ ثاقب روا حاصل خلوص، میتھیو محسن، زاہد خان، خالق آرزو حسن پرویز سید، سرفراز عارض، رخسانہ سمن، عبدالرؤف زین شمیلہ سعید، جیا قریشی، حنا بابر چودھری، نوید صادق	106 تا 176
10	طنز و مزاح / خاکے	ہمایون خان	177 تا 179
11	افسانے	ابدال بیلا، اسلام عظمی، فرخندہ شمیم، رخشندہ نوید، دردانہ نوشین خان آسناتھ کنول، کلیم خارجی، محمد طارق علی، آفتاب محمود خمس، نعیم فاطمہ علوی	180 تا 218
12	نظمیں	خامد احمد، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، محمد انیس انصاری گلزار بخاری نثار ترابی، قیوم طاہر، نائلہ راٹھور، امجد بابر ظہور چوہان، شبیر ناز ش، شبہ طراز، عارف فرہاد، غلام مرتضیٰ عاصم بخاری، بشیر احمد حبیب، محمد عبداللہ، نگہت اکرم، اعجاز رضوی	219 تا 241

حمد

دُنیا بھی ، ریاست بھی ، یہ بستی بھی ، نگر بھی
یارب! تِری رحمت سے ہُوں مَیں بھی، مِرا گھر بھی

تجھ سے ہی جِلا پاتی ہیں سب خوبیاں میری
یہ فکر ، یہ فن اور یہ انداز نظر بھی

رہتے ہیں مکانِ خس و خاشاک میں لیکن
قائم ہے کرم سے تِرے دیوار بھی در بھی

بیٹھے ہیں تِرے سایۂ رحمت میں وگرنہ
دُنیا تو اُڑا دیتی ہے دستار بھی ، سر بھی

الطافِ خداوندی سے چلتا ہے مِرا کام
آتا ہے مِرے سامنے تو خیر بھی شر بھی

مَیں صرف اشارے پہ تِرے بڑھتا ہُوں آگے
درپیش مِرے عزم کو ہو جیسا سفر بھی

مالک ! مجھے اُن لوگوں سے محفوظ ہی رکھیو
پیمانِ وفا جن کا اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

مَیں شکر ادا کرتا ہُوں ، پر لگتا ہے مجھ کو
کافی نہیں اِس مد میں مجھے عمرِ خضر بھی

خاور اعجاز

نعتؐ

غنیم جنگ پہ جن موسموں ابھارتا ہے
وہ دن بھی حلمِ حرائی سے دل گزارتا ہے

اسیؐ کے نام سے بَن اپنے باغ ہوتے ہیں
اسیؐ کا عشق ہمارے چمن بہارتا ہے

رکھ اُسؐ کی سیرتِ روشن کو دھیان میں کہ یہ ربط
سرِ شعور بصیرت کا نور اتارتا ہے

اسیؐ کے سلسلۂ سعد کا تسلسل ہے
جہاں بھی خیر منارہ کوئی اُسارتا ہے

اُسی کی دُھن میں ہے اک سرمدی سکوں کا سرور
وہ جس کا ہجر شب و روز بیقرارتا ہے

سُجھا رہا ہے وہ مہتاب ہی رہِ منزل
کہ فلسفہ تو اندھیروں میں تِیر مارتا ہے

ہم اُس کی راہ کے خوش بخت راہرو عالی
جو اک نگاہ سے قطرے کو بے کنارتا ہے

جلیل عالی

نعتؐ

ہم پہ احسان ہے کتنا، مرے مولا، تیرا
ہو کے مبعوث پیمبر یہاں آیا تیرا

شبِ تیرہ میں جونہی نام پکارا تیراؐ
چارسُو پھیل گیا پل میں اُجالا تیراؐ

چل رہا ہوں مَیں فقط لے کے سہارا تیرا
''مَیں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا''

اَور درکار ہی کیا ہم کو شفاعت کے لئے؟
نام لیواؤں کو کافی ہے حوالہ تیراؐ

معجزہ ہے کہ تریؐ عمر تو صحرا میں کٹی
پھر بھی بہتا رہا رحمت کا یہ دریا تیراؐ

مَیں ترے عہد میں پیدا نہ ہوا، صد افسوس
کاش خوابوں میں ہی دیکھوں کبھی چہرا تیراؐ

لے گیا کون اُجالے کی طرف ہم سب کو؟
ذہن میں آتا ہے نام ایک ہی، تیرا، تیرا!

گندگی پھینکنے والوں کو بھی کرتا تھا معاف!
سنگباری پہ بھی غُصّے میں نہ آنا تیرا

نسیمِ سحر

نعتؐ

خیرالورا کے فیض سے ہم کو ہوا عطا
ورثہ کمال صدق و صفا آئنہ بنا

تزئینِ ہست و بود کے موجب حضور ہیں
جس سے حیاتِ دہر کا نقشہ بدل گیا

اسمِ گرامی آپؐ کا سن کر جو شاد ہو
قلبِ سلیم کا اسے تحفہ عجب ملا

ظلمت کدوں میں کیسی ضیا پھوٹنے لگی
خفتہ نصیب ذرہ بھی یک دم چمک اٹھا

اعجاز ہے درود کا ہاں اس کے درد کا
جو ڈولتا سفینہ تھا ، ساحل پہ آ لگا

پس ماندگی میں جو کہ تھا اپنی مثال آپ
انؐ کی نگاہِ لطف سے وہ کیا سے کیا ہوا

ہو تذکرہ بس آپؐ ہی کا ہر محاذ پر
تاریکیوں کو کر کے رہے گا یہی فنا

بس نسبتِ حضورؐ مجھے سازگار ہے
جس نے مجھے سنبھال لیا،حوصلہ دیا

میرا ریاض نعت مرے کام آ گیا
دستِ کرم حضورؐ کا مجھ پر سدا رہا

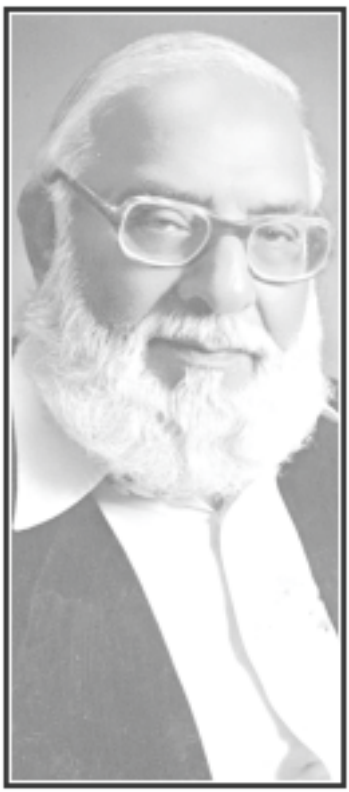

سید ریاض حسین زیدی

نعت ؐ

مری نگاہ مرا دل ہے آپ کی محفل
حضور آپ کی محفل ہے آپ کی محفل

رچی ہوئی ہے مہک آپ کے پسینے کی
وفور رقص عنادل ہے آپ کی محفل

نفس نفس میں ہے شامل حقیقتوں کا شعور
خیال و خواب کا حاصل ہے آپ کی محفل

حضور آپ ہیں مہمان عرش والے کے
حدودِ عرش میں شامل ہے آپ کی محفل

پہنچ رہے ہیں زمانے کی چوٹ کھائے ہوئے
سفر کی آخری منزل ہے آپ کی محفل

بھنور بھنور ہے ہمیں راستہ دکھاتا ہوا
سجی ہوئی لب ساحل ہے آپ کی محفل

ہے جن و انس و ملائک کی درسگاہ کنور
ازل سے افضل و کامل ہے آپ کی محفل

اعجاز کنور راجہ

نعتؐ

دیکھا نہ سنا احمدِ مختار سا کوئی
کوئی بھی نہیں ہے شہِ ابرار سا کوئی

دیکھے ہیں شب و روز نے کتنے ہی زمانے
دیکھا نہ مگر آپ کے ادوار سا کوئی

کیا شہرِ مدینہ سا کوئی شہر کہیں ہے!
بازار نہیں طیبہ کے بازار سا کوئی

اے کاش کہ وہ عشقِ محمدؐ سے ہو موسوم
جذبہ جو مرے دل میں ہے اک پیار سا کوئی

آقا مرے خوابوں کو خیالوں کو سجا دیں
جلوہ نہیں ہے آپ کے دیدار سا کوئی

ویسے تو جہاں میں بڑے دربار ہیں لیکن
دربار نہیں آپ کے دربار سا کوئی

دیتے ہیں عساکر کے یہ سردار گواہی
دنیا میں نہیں بدر کے سالار سا کوئی

احمد جلیل

نعتؐ

رنگ اور نور میں بے ساختہ ڈھل کر آئے
مدحت و نعت میں ہر لفظ منور آئے

جانبِ طیبہ ملے اِذنِ زیارت مجھ کو
مجھ سے عاصی کا بلندی پہ مقدر آئے

اِس قدر مجھ کو عطا آپؐ کی رحمت سے ہوا
ہر قدم پاؤں میں اِک تختِ سکندر آئے

جب بھی آئی ہے کبھی جان کو تشنہ کامی
جُوئے کوثر سے کئی جام نکل کر آئے

پہلے کچھ پیڑ کھجوروں کے نظر آتے ہیں
پھر چٹائی کا مرے خواب میں بستر آئے

جب بھی نکلوں میں کبھی گنبدِ خضرا کی طرف
ہر قدم راہ میں اِک چشمۂ کوثر آئے

رحمتیں اُنؐ کی برستی ہیں سدا مجھ پہ نبیل
آپؐ کے فیض مرے کام برابر آئے

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

زمانے میں یہ جتنی روشنی ہے
چراغِ مصطفیٰ کی روشنی ہے

جو ہوں گویا حدیثِ قدسیہ ہے
نہ ہوں گویا تو پھر بھی روشنی ہے

اُنھی کے نور سے دل ہیں منور
دو عالم میں اُنھی کی روشنی ہے

مرے ہونٹوں پہ ذکرِ مصطفیٰ ہے
مری باتوں میں کتنی روشنی ہے

کہا اقرا ، یہ سب ہی جانتے ہیں
اور اس کے بعد ساری روشنی ہے

جو ذرہ تھا ، ستارہ ہو گیا ہے
کرم ان کا ، اُنھی کی روشنی ہے

وہ بڑھ جاتی ہے جوں جوں پھیلتی ہے
کہ وہ نورِ خدا کی روشنی ہے

بشیر احمد حبیب ان محفلوں میں
درودِ پاک ہی کی روشنی ہے

بشیر احمد حبیب

عقیدت

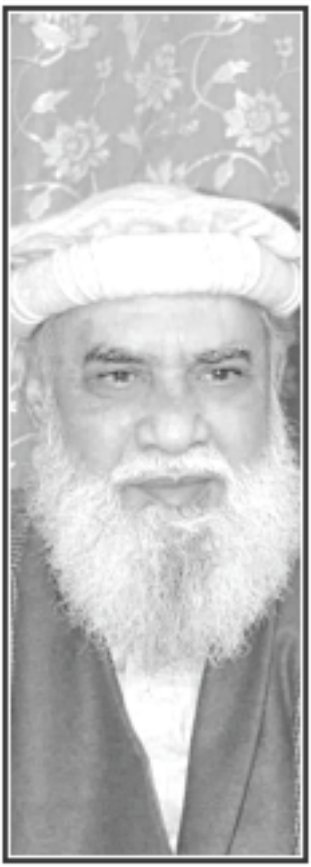

کیسے بھولے بھلا جنت کا نظارہ ہم کو
کاش لے جائے وہ جنت میں دوبارہ ہم کو

پھر سمجھ آتی کہ شعب ابو طالب کیا ہے
کرنا پڑ جاتا اگر اس میں گزارہ ہم کو

باندھ رکھا ہے گرہ میں ترا قولِ فیصل
ایک اللہ کا کافی ہے سہارہ ہم کو

مشورے اب بھی غلط ملتے ہیں اس سے جس نے
شجر ممنوعہ کی جانب تھا ابھارا ہم کو

شکر کرتے ہیں کہ اے خالقِ تزئینِ جہاں
امتِ احمد مرسل میں اتارا ہم کو

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

وہ ہر نعمت کے مالک ، وہ نعمتوں کے قاسم
کاش مجھے دونوں ٹھہرا لیں رحمت کا حقدار

نعمان منظور

عقیدت

نور کی ٹھنڈی شعاؤں کے سروں پر لکھ دیا
نامِ احمدؐ میں نے دل کی دھڑکنوں پر لکھ دیا

خوش نصیبی ہے ہماری اُمتِ وسطیٰ کا نام
خود خدا نے بخششوں کے سلسلوں پر لکھ دیا

رحمتِ عالم نے آ کر اسمِ پاک اللہ کا
ان گنت پیشانیوں کی تختیوں پر لکھ دیا

رفعتِ ذکرِ نبی یوں کی خدائے پاک نے
اسمِ سرور آنے والی ساعتوں پر لکھ دیا

بارہا ایسا ہوا افلاک کو تکتے ہوئے
اسمِ احمدؐ بادلوں کے قافلوں پر لکھ دیا

ڈھونڈ کر میں نے رضاؔ جو بھی ملا لفظِ حسیں
مدحتِ محبوبؐ ہی میں کاغذوں پر لکھ دیا

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لاج وہ رکھ لیں گے میری بھی سائیں کے دربار
صلی اللہ علیہ وسلم ، وہ سچی سرکار

عقیدت

آنکھوں کو روشنی سے سجاؤں گی ایک دن
میں پھر درِ رسول پہ جاؤں گی ایک دن

جب میں لرزتے ہاتھوں سے تھاموں گی جالیاں
نم دیدہ ہو کے نعت سناؤں گی ایک دن

اللہ کے حبیب کا ہو آسرا مجھے
غم کے نگر سے دور میں جاؤں گی ایک دن

اس دھوکہ اور فریب کی دنیا کو چھوڑ کر
میں روح کے چمن کو بساؤں گی ایک دن

افروز خاکِ طیبہ جو خاکِ شفا بھی ہے
آنکھوں میں جس کا سرمہ لگاؤں گی ایک دن

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اسم مُبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ وَرق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

عقیدت

محمودِ کبریا ہیں ختم الرسل محمدؐ
ہر حمد کی بِنا ہیں ختم الرسل محمدؐ

اس حق کا منتہیٰ بھی مولائے کل محمدؐ
جس حق کی ابتدا ہیں ختم الرسل محمدؐ

احمد ہیں وہ ازل سے، حامد وہ ابد کے
ہر شان میں سوا ہیں ختم الرسل محمدؐ

غیب و شہود میں ہم بس اپنے حال تک ہیں
کیا علم تا کجا ہیں؟ ختم الرسل محمدؐ

طاعت کا اپنے رب سے اور ہر کسی سے پہلے
خود عہد، خود وفا ہیں ختم الرسل محمدؐ

نازاں ہے جس کی صورت پہ خود خدائے قدرت
وہ حسنِ دل ربا ہیں ختم الرسل محمدؐ

کس کا مقام اعلیٰ، نطق و بیاں سے بالا؟
سب لفظ ہم نوا ہیں: ختم الرسل محمدؐ

خیرات جس کے در سے لیتے ہیں علم و حکمت
وہ سید السخا ہیں ختم الرسل محمدؐ

طاغوت کی جفا سے دی ہے نجات انھوں نے
کیا دافعِ البلا ہیں! ختم الرسل محمدؐ

بے صوت رہ گئے تھے جو صلح و امن، سب کی
آوازِ دل کشا ہیں ختم الرسل محمدؐ

اکملت میں، لکم میں اور دینکم میں روشن
ہر حرف کی ضیا ہیں ختم الرسل محمدؐ

اتممت سے، علیکم سے، نعمتی سے ثابت
ہر حق کا مدعا ہیں ختم الرسل محمدؐ

اسریٰ بعبدہ میں گونجے ہے کس کی رفعت
سب مجد ہم صدا ہیں: ختم الرسل محمدؐ

میثاق انبیا کی بزمِ ازل سجی تو
اقرار سب کا تھا: ہیں ختم الرسل محمدؐ

ہے لانبی بعدی ہر دور میں منادی
کوئی نہ آئے گا، ہیں ختم الرسل محمدؐ

ان کے جمال صورت سے پا کے وجدِ عشرت
ہر عشق نے کہا: ہیں ختم الرسل محمدؐ

ہر سمت ہیں اجالے فکر و نظر کے جس سے
وہ نورِ حق نما ہیں ختم الرسل محمدؐ

ہیں دو ہی نورِ ایماں، وہ جن پہ حمد نازاں
یا الحمید یا ہیں ختم الرسل محمدؐ

آصف! یہ در ہے ان کا سب کے لیے کشادہ
مختارِ ہر عطا ہیں ختم الرسل محمدؐ

مرزا آصف رسول

عقیدت

خلیل اللہ کے نخلِ دعا پر یوں ثمر آیا
محمد مصطفیٰ آئے ، رخِ ہستی نکھر آیا

فضائے روح کو شادابیوں نے تازگی بخشی
نظر میں جب بھی عکسِ گنبدِ خضریٰ اُتر آیا

نہیں انکار ممکن، ہے وسیلہ معتبر ان کا
درودِ پاک پڑھنے سے دعاؤں میں اثر آیا

محبت کا چلن پایا ، مروت کی ادا پائی
ہوئے منسوب جب ان سے تو جینے کا ہنر آیا

وہ سرچشمہ ہیں علم و آگہی کا، ان کی محفل میں
گیا جو بے خبر، لے کر وہ صدیوں کی خبر آیا

نبی کی نعت کی خوشبو تو میری ہم سفر ہو گی
عدم آباد کا درپیش مجھ کو جب سفر آیا

فرشتے آ کے بیٹھے ہیں نبی کا ذکر سننے کو
یہ فیضِ نعت ہے ، کیسا مقدر اوج پر آیا

شہِ کونین کی سیرت سے پاکر حوصلہ عاجز
کٹھن راہوں سے جیون کی سہولت سے گزر آیا

نوید عاجز

عقیدت

بھلے بتا نہیں سکتا ، مگر حسینی ہے
جو سایہ دار ہے ہر اک شجر حسینی ہے

وہاں یقینی عزادار بس رہے ہوں گے
عَلَم لگا ہو تو سمجھو کہ گھر حسینی ہے

وہ تیر کھاتا رہا ساتھ ظلم سہتا رہا
سو ذوالجناح بھی تو سر بہ سر حسینی ہے

یزید آج بھی موجود ہیں نظر رکھنا
جو آج بھی ہو سرِ نیزہ سر حسینی ہے

ہوئی ہے نم علی اصغر کا نام لینے پر
صغیر یعنی تری چشمِ تر حسینی ہے

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

راہ جمال کی روک نہ پائے ، شیشے کی دیوار
عکس کے ساتھ اُترا ے خالد آئینے کے پار

رباعیات

ماحول میں ڈر خوف کے ڈیرے ہیں بہت
خدشات بڑے رات کو گھیرے ہیں بہت
وابستہ ہے ڈور سے تحفظ تیرا
آوارہ پتنگوں کے لٹیرے ہیں بہت

.....

آزاد وطن بخش کے خوشحال کیا
پھر تو نے عطا ہم کو زر و مال کیا
اس ہاتھ کو توڑ اے مرے خالق جس نے
آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

.....

جو مصر وطن یوسف و یامین کا ہے
نزدیک وہاں خطہ فلسطین کا ہے
افرنگ کی سازش سے ملا غیروں کو
انصاف یہ کیا عالمی آئین کا ہے

.....

آفت کوئی خود آپ نہ ٹلتے دیکھی
گاڑی نہ بلاوجہ سنبھلتے دیکھی
جس میں کوئی خواہش نہ ہو تبدیلی کی
اس قوم کی حالت نہ بدلتے دیکھی

.....

نیکی ملے نیکوں سے روایت ہے بہت
نفرین کے قابل غلط عادت ہے بہت
لیکن نہ کھلیں جس کی بری باتیں بھی
سمجھو کے تمھیں اس سے محبت ہے بہت

.....

میں چیز ہوں کیا حمدِ الٰہی لکھوں
اوقات نہیں خلق پناہی لکھوں
دارائی میرے لفظ و بیاں سے ہے بلند
کس ڈھنگ سے اس شاہ کی شاہی لکھوں

.....

فیض اس کا ہی جیون کا سبب دیکھا ہے
قہر اس کا غم و رنج و تعب دیکھا ہے
دنیا کے شہنشاہ بھی جھکتے دیکھے
اس شاہ کا یوں قہر و غضب دیکھا ہے

.....

تھی خُلقِ پیمبر پہ وہ زبان ایسی
اس قُرب نے کر دی تھی فزوں آن ایسی
سب بیبیوں کو رشک تھا اس رتبے پر
گلزار خدیجہ کو ملی شان ایسی

.....

یا رب مدد ے خالق دوراں مدد ے
کر مشکلیں ناچیز کی آساں مدد ے
کرتے ہیں گزارش تری درگاہ میں سب
رہتی ہے مری فکر پریشاں مدد ے

.....

اے خالقِ کُل رب جہاں ادرکنی
ہیں زیرِ نگیں کون و مکاں ادرکنی
میں کرکِ کمزور ہوں کیا عرض کروں
دیتا ہے تو ہی تاب و تواں ادرکنی

گلزار بخاری

قطعات

اجمل اعجاز

تند دریا کے سامنے بیٹھا
سوچتا ہوں کہ ایک قطرہ ہوں
ڈوب جاؤں تو بلبلہ ٹھہروں
تیرتا ہوں تو جاں کا خطرہ ہوں

.....

ایک گھر کے مکین ہم دونوں
حیثیت میں عجیب لگتے ہیں
حسن کی تو امیر وہ ٹھہرے
مال کے ہم غریب لگتے ہیں

.....

کچھ سنانا ہے حال دل اپنا
گر توجہ تمھاری مل جائے
آسمانوں کی سیر کرنی ہے
اُڑنے والی سواری مل جائے

.....

راستے ہو گئے تھے سب مسدود
اس سے ملنے کی رہ نکالی تھی
خواب میں بھی پلٹ کے آنا پڑا
رات بھی کالی ، بلی کالی تھی

.....

زندگی میں ہیں الجھنیں اتنی
کس لئے آیا تھا میں ، بھول گیا
کرہ ارض فتح کرنا تھا
دو قدم پر ہی سانس پھول گیا

گیت

ابھی وہ آئے ہیں اور ابھی یوں دِل و نظر میں سما رہے ہیں

شباب و حسن و جمال و کیف و مہک کا دریا بہا رہے ہیں

ہواؤ گاؤ، فضاؤ جھومو، ستارو جھک کر جبیں کو چومو

کہ آج وہ شانِ بے نیازی سے زیرِ لب گنگنا رہے ہیں

لو اُن پہ عہدِ شباب آیا، لو تھوڑا تھوڑا حجاب آیا

چرا کے نظریں ملا رہے ہیں، ملا کے نظریں چرا رہے ہیں

اَدا سے پلکیں جھکی ہوئی ہیں، نگاہیں جیسے رُکی ہوئی ہیں

نظر ملاتے نہیں ہیں پھر بھی خیال میں مسکرا رہے ہیں

تمام عالم ہنسی میں ڈوبا ہُوا سا محسوس ہو رہا ہے

کہ وہ چمن کی روش روش پر گُلِ تبسم لٹا رہے ہیں

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دانہ دُنکا چگنے نکلیں،

چوگا لے کر گھر کو آئیں

ڈاکٹر وحید قریشی_ایک دیوقامت شخصیت

یہ اکتوبر 1960 کی بات ہے۔ ایم اے اردو سالِ اول کی تدریس ابھی شروع ہوئی تھی۔ ایک دن کلاس میں ایک استاد تشریف لائے۔ بہت موٹے اور لمبے۔ ہاتھ میں براؤن رنگ کا تھیلا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ سوٹ پہنے، ٹائی باندھے۔ سر پر جناح کیپ، کرسی میں پھنس کر بیٹھ گئے۔

بھاری تھیلا میز پر رکھا۔ اپنا تعارف نہیں کرایا لیکن جو ٹائم ٹیبل ہمیں دیا جا چکا تھا اس کی وجہ سے طالب علم سمجھ گئے کہ یہ ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔ وہ ''فارسی شاعری کی روایات و اسالیب'' پڑھاتے تھے جو تنقید کے پرچے کا جز تھا۔

ڈاکٹر صاحب ان دنوں اسلامیہ کالج سول لائنز میں اردو اور فارسی کے استاد تھے۔ جتنے موٹے تھے اتنے ہی ذہین تھے۔ بزلہ سنجی اور ذکاوت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آواز بارعب اور گونج دار۔ بہت بلند آواز میں لیکچر دیتے تھے جو کلاس سے باہر بھی بآسانی سنائی دیتا تھا چونکہ میں نے بی اے آنرز فارسی میں کیا تھا اس لیے ان کے لیکچر بڑی دلچسپی سے سنتا تھا اور بہت سی نئی باتیں سیکھتا تھا کہیں کہیں لقمہ بھی دیتا تھا اور ان کی آرا سے اختلاف کا اظہار بھی کرتا تھا لیکن وہ اختلاف رائے کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے اس لیے میں اُن کا گرویدہ ہو گیا۔

جب سالِ اول سے سالِ دوم میں پہنچے تو کئی طلبہ تحقیقی مقالہ لکھنا چاہتے تھے جو مضمون نویسی کے پرچے کا متبادل ہوتا تھا۔ سیّد عبداللہ صدر شعبہ اردو اور پرنسپل تھے، انھوں نے میری پسند سے مجھے ''اردو میں قطعہ نگاری'' کا موضوع دیا اور یہ بھی فرمایا کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی آپ کے نگرانی ہوں گے۔ ان سے رہنمائی لیجیے۔ میں ڈاکٹر عبادت صاحب کو دیگر اساتذہ کے مقابلے میں زیادہ قریب سے جانتا تھا لیکن وہ ان دنوں مجھ سے بوجوہ ناراض تھے اس لیے میں ان کی نگرانی میں کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان دنوں شعبہ اردو میں ایک کلرک جمیل الرحمٰن عثمانی تھے۔ بڑے نستعلیق اور وضع دار شخص تھے۔ ان سے میری اچھی علیک سلیک تھی۔ میں نے جب یہ مشکل ان سے بیان کی تو وہ کہنے لگے کہ سید عبداللہ صاحب نے آپ سے زبانی کہا ہے کوئی تحریری حکم نہیں

خواجہ محمد زکریا

دیا۔ وہ اب تک بھول چکے ہوں گے۔ آپ دوبارہ ان کے پاس جا کر کہیں کہ ڈاکٹر وحید قریشی کو مقالے کا نگران مقرر کر دیا جائے۔ اُمید ہے کہ وہ مان جائیں گے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور وہ فوراً راضی ہو گئے۔ اس طرح مجھے وحید صاحب کی رہنمائی میں کام کرنے کا موقع مل گیا اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

ان دنوں وحید قریشی صاحب کی عمر پینتیس برس کے قریب تھی۔ تمام ذہنی صلاحتیں عروج پر تھیں۔ نسبتاً فراغت بھی تھی اس لیے وہ مجھے بہت وقت دیتے تھے۔ جلد ہی انھیں اندازہ ہو گیا کہ میں محنتی طالب علم ہوں، اوزانِ شعری کی شناخت رکھتا ہوں اور کثرت سے اشعار یاد ہیں تو مجھ سے بہت شفقت کرنے لگے۔ وہ ان دنوں 229 این سمن آباد میں رہتے تھے۔ میرا گھر بھی ان سے زیادہ دور نہیں تھا اس لیے انھوں نے فرمایا کہ تھیسس کے سلسلے میں کچھ پوچھنا ہو تو میرے گھر آ جایا کرو۔

پہلی دفعہ جب میں ان کے ہاں پہنچا اور گھنٹی بجائی تو انھی کی وضع قطع کے ایک صاحب باہر نکلے۔ اتنے ہی لمبے اور موٹے۔ شکل میں وحید صاحب سے مشابہت، میں سمجھا ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی ہیں۔ مجھ سے پوچھا: کاکا کس سے ملنا ہے؟ میں نے بڑے احترام سے کہا: ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے۔ انھوں نے زور سے آواز دی۔ وحید! وحید!! جواب میں وحید قریشی صاحب کی آواز آوائی: جی ابا جی! وہ بولے! ایک لڑکا آیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر بُلا لیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ غالباً وہ کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ میں پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم سے ڈائننگ روم ملحق تھا۔ کھانے کی میز پر برتن پڑے تھے اور پلاؤ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بعد میں مَیں ان گنت دفعہ ان کے ہاں گیا۔ عموماً میں نے ان کی میز پر پلاؤ ہی دیکھا۔ جب میں ذرا پر تکلف ہو گیا تو ایک روز پوچھا۔ آپ ہفتے میں کتنی بار پلاؤ کھاتے ہیں؟ فرمایا: پہلے تو ہر روز کھا تا تھا، اب ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے اس لیے ہفتے میں دو تین بار سے زیادہ نہیں کھاتا چنانچہ ان کے موٹاپے کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔

جلد ہی میں ڈاکٹر صاحب کے قریب ترین بیٹھنے والے شاگردوں میں شامل ہو گیا۔ وہ میری بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ تحقیق کے تاخذ پر انھیں جو عبور تھا وہ سید عبداللہ صاحب سمیت کسی اور استاد میں نہیں دیکھا۔ وہ کتابیں بڑی تعداد میں خریدتے تھے اور نادر کتابوں کے حصول میں سرگرم رہتے تھے۔ اس مشغلے پر انھوں نے بہت سرمایہ صرف کیا۔ ابھی وہ زمانہ ان کی جوانی ہی کا تھا۔ انھوں نے بہت سے موضوعات پر تحقیقی کام کرنے کے منصوبے بنا رکھے تھے۔ فارسی زبان و ادب پر اُن کی خصوصی توجہ تھی۔ ایم اے (فارسی) کے بعد انھوں نے تاریخ کے مضمون میں ایم اے کیا تھا اور فارسی میں انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی مل چکی تھی۔ وہ ان سب موضوعات پر مواد جمع کرتے تھے۔ کتابیں، رسائل،

مخطوطے، حوالہ جاتی کتابیں، لغات، تذکرے، شعری مجموعے، تحریکِ پاکستان، غالبیات، اقبالیات اور معلوم نہیں کس کس موضوع پر کیا کچھ اکٹھا کرتے رہتے تھے۔ 1963 میں وہ اپنی زیرِ ترتیب کتاب ''اردو کا بہترین انشائی ادب'' کو مکمل کر رہے تھے۔ میں ان کی معاونت کر رہا تھا۔ انھوں نے مجھے حکم دے رکھا تھا کہ اس کتاب میں جن مصنفین کا انتخاب شامل کیا گیا ہے ان کے مختصر حالات اور تصانیف کی مکمل فہرستیں تیار کرو۔ میں جب مختلف لائبریریوں سے تصانیف کی فہرستیں اپنی دانست میں مکمل کر چکا تو ایک دن یہ کاغذات لے کر ان کے ہاں پہنچا۔ ان کاغذات کو ایک نظر دیکھا۔ پھر اٹھے اور دو ڈبے اٹھا لائے جو ڈوری سے بندھے تھے۔ ڈوری کو کھولا تو معلوم ہوا کہ ڈبوں میں پاکستان اور ہندوستان کے بڑے بڑے ناشرین کی شائع کردہ کتابوں کی فہرستیں ہیں۔ کہنے لگے: ان فہرستوں سے بعض اوقات ایسی کتابوں کے نام مل جاتے ہیں جو کتب خانوں سے غائب ہو چکی ہیں اس لیے میں انھیں سنبھال کر رکھتا ہوں۔

''میر حسن اور ان کا زمانہ'' پر وہ کام مکمل کر چکے تھے جس پر انھیں 1965 کے شروع میں ڈی لٹ ڈگری ملی تھی۔ ان کا ارادہ میر حسن کی تمام مثنویوں کو دو جلدوں میں مرتب کرنے کا تھا۔ پہلی جلد میں سحر البیان کے سوا، باقی تمام مثنویوں کو یکجا کر کے چھپوانا تھا اور دوسری جلد میں سحر البیان کی تدوین کا ارادہ تھا۔ جلد اوّل تو انھی دنوں مجلسِ ترقی ادب کی طرف سے شائع ہو گئی۔ مقدمے میں ان مثنویوں کے مطبوعہ غیر مطبوعہ مآخذ کا بھی تفصیل سے ذکر کر دیا مگر مقدمے کے آخر میں لکھا۔

''مثنویاتِ میر حسن'' کا متن حاضرِ خدمت ہے۔ دوسری جلد میں ''سحر البیان'' کا متن اور دونوں جلدوں کے حواشی استدراکات اور اشاریے درج ہوں گے۔''

لیکن دوسری جلد پر کام ایسا رکا کہ کبھی مکمل نہ ہو سکا۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو تیاری کی تھی وہ حیرت انگیز تھی۔ سحر البیان کے مخطوطات اور مطبوعہ متن جمع کیے تھے۔ ایک دن ان کے کتاب خانے میں مَیں نے پرندوں کی تصویروں والی کچھ رنگین کتابیں دیکھیں۔ پوچھنے پر بتایا کہ سحر البیان میں پرندوں کے بہت سے نام آتے ہیں اور بعض ناموں کا صحیح علم نہیں ہوتا۔ چنانچہ متعلقہ مقامات پر حواشی درج کرنے کے لیے یہ کتابیں خریدی ہیں۔ یہی صورت دیگر علوم و فنون کی کتابوں کے سلسلے میں بھی تھی۔ لیکن اتنی مثالیت پسندی ہو تو کام نامکمل رہ جاتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے کئی تحقیقی منصوبوں کا یہی حشر ہُوا۔

ڈاکٹر صاحب کی یادداشت غیر معمولی تھی۔ وقتِ آخر تک ان کے حافظے میں بہت کچھ محفوظ تھا لیکن چونکہ صحت بہت خراب ہو چکی تھی اور بستر سے اُٹھنا ان کے لیے محال تھا اس

لیے آخری آٹھ دس برس میں ارادے کے باوجود عملی طور پر وہ کوئی کام نہیں کر سکتے تھے البتہ بستر پر لیٹے کلام موزوں کرتے رہتے تھے اور ہزاروں دوہے لکھ ڈالے تھے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ طویل مدت کام کیا ہے۔ ان سے ایک کم پچاس سال تعلق رہا ہے۔ بطور شاگرد اور بحیثیت رفیق کار انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ بیک وقت ڈین آف فیکلٹی، پرنسپل اورینٹل کالج اور صدر شعبہ اردو رہے۔ ایک منتظم کے طور پر میں نے ان کے ماتحت کئی سال کام کیا۔ انھیں بہت دیانت دار اور صاف ستھرا شخص پایا۔ کسی زمانے میں وہ پنجاب یونیورسٹی کے اہم ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ہر اہم باڈی کے وہ کنوینر یا رکن تھے۔ ایک ہی وقت میں ڈین آف فیکلٹی، پرنسپل اور صدر شعبہ اردو کے عہدوں پر کام کرنے کے علاوہ سنڈیکیٹ کے ممبر تھے، فنانس پلاننگ کمیٹی میں تھے۔ یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری کے چیئرمین تھے اور درجنوں دیگر کمیٹیوں کے رکن تھے۔ وائس چانسلر حضرات ان کے مشوروں پر عمل کرتے تھے لیکن انھوں نے ذاتی منفعت کی طرف کبھی دھیان نہ دیا۔ یونیورسٹی سے جانے کے بعد مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین رہے، اقبال اکیڈمی پاکستان کے ڈائریکٹر رہے، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی میں سالہا سال ہر سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ بزم اقبال پر بھی متصرف تھے۔ ان میں سے بعض اداروں کا بجٹ بہت زیادہ تھا لیکن انھوں نے خود کھایا اور نہ کسی اور کو کھانے دیا۔ گورنمنٹ کا مال خرچ کرنے میں ان کی جز رسی یقیناً قابل داد تھی اور سرکاری رقوم اتنی ہی احتیاط سے خرچ کرتے، جیسے کوئی اپنے گھر کے لیے خریداری کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اسلامیہ کالج سے اورینٹل کالج پڑھانے آتے تھے تو سائیکل پر ''مارا مار'' کرتے ہوئے آتے۔ چند سال کے بعد ویسپا سکوٹر لے لیا۔ مزید چند سال گزرے تو چھوٹی سی کار خرید لی۔ اس سے زیادہ خرچ کرنے کی استطاعت نہیں تھی۔ کار خود ہی ''ڈرائیو'' کرتے اور ڈرائیور صرف اس وقت رکھتے تھے جب کسی بڑے سرکاری ادارے سے وابستہ ہوتے۔ جہاں کار اور ڈرائیور کی سہولت سرکار کی طرف سے دی جاتی۔ سرکاری سہولیات کو بھی بڑی احتیاط سے تصرف میں لاتے تھے۔

کسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب بڑے خوش مزاج تھے۔ فطرت نے حسِ مزاح ان میں کوٹ کوٹ کر بھر رکھی تھی۔ بات بات پر فقرہ چست کرتے اور قہقہے پر قہقہہ لگاتے۔ برموقع انھیں ایسے جملے سوجھتے تھے کہ اچھے فقرے باز بھی عاجز آ جاتے تھے۔ شائستہ اور شستہ مزاح کے ساتھ طنز و تمسخر سے بھی گریز نہیں کرتے تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جو جملہ ضائع نہیں کرتے، دوست ضائع کر دیتے ہیں۔ اپنی ذات پر لوگوں کے چست کیے ہوئے جملوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ بعد میں مسلسل بیماریوں نے قدرے چڑچڑا بنا دیا تھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب ایک پہلو دار شخصیت کے حامل تھے۔ عالم اور محقق ہونے کے ساتھ یونیورسٹی کی سیاست میں بھی سرگرم رہتے۔ 1973 میں جب نیا یونیورسٹی ایکٹ نافذ ہوا تو ڈین آف فیکلٹی کے عہدے کے لیے الیکشن کا قانون بنایا گیا ڈاکٹر صاحب نے الیکشن لڑا اور کامیاب ہوئے ۔ سینڈیکیٹ جیسی اہم ترین ''باڈی'' کے الیکشن میں حصہ لیا اور اس میں بھی کامیابی حاصل کی۔ 1973 میں اور مابعد کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کے اہم ترین اور موثر ترین منتظم تھے البتہ 1982 سے وہ کچھ کم موثر ہو گئے تھے۔ سنڈیکیٹ کی رکنیت ختم ہونے کی وجہ سے وہ مرکزی لائبریری کے چیئرمین بھی نہ رہے البتہ پرنسپل اورینٹل کالج کے عہدہ اس وقت تک ان کے پاس رہا جب تک وہ پنجاب یونیورسٹی میں رہے۔

انھوں نے بہت سے ادبی اور تحقیقی جرائد کی ادارت بھی کی ۔ اورینٹل کالج میگزین، مجلۂ تحقیق، رسالۂ اقبال، رسالۂ اقبال ریویو رسالہ مخزن اور اخبار اردو کے سالہا سال مدیر رہے۔ انھیں ان رسائل کے لیے اہلِ قلم سے تعاون حاصل کرنے کا سلیقہ تھا اور مصروف ترین لوگوں سے بھی کچھ نہ کچھ لکھوانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ ان کے زمانہ ادارت میں یہ رسائل اعلیٰ معیار کے حامل نظر آتے تھے۔

ایک مختصر عرصے کے لیے انھوں نے میر جملہ لاہوری کے قلمی نام سے اخباری کالم بھی لکھے۔ اور طنزیہ کالم لکھ کر کئی دوستوں کو ناراض کیا تاہم سچ تو یہ ہے کہ وہ مزے مزے کے جملے لکھتے تھے اور طعن و تضحیک سے بھی حسبِ ضرورت کام لے لیتے تھے۔

وہ سچے اور پکے پاکستانی تھے۔ قائداعظم اور علامہ اقبال سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور اس معاملے میں رورعایت سے کام نہیں لیتے تھے۔ ان کا مزاج تحریک پاکستان کے مسلم لیگیوں جیسا تھا۔ 23 مارچ 1940 کو جب منٹو پارک لاہور میں قرارداد پاکستان پاس ہوئی تو ڈاکٹر صاحب میٹرک کا امتحان دے چکے تھے۔ اور اس جلسے میں ایک ہمدرد سامع کی حیثیت سے شریک تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کے کچھ اور رنگ بھی تھے۔ کبھی وہ جلالی بزرگ بن جاتے تھے۔ کبھی سپہ سالار معلوم ہوتے تھے۔ کبھی انسپکٹر پولیس دکھائی دیتے تھے اور ان سب کے برعکس کبھی شفیق استاد، ہمدرد افسر، معاون رفیقِ کار نظر آتے تھے وہ مجمع الامراض تھے، بستر پر لیٹے لیٹے انسان اپنے آپ سے بھی بیزار ہو جاتا ہے اس لیے ان کی برہمی بالکل بجا تھی لیکن انسانوں میں برداشت کم ہوتی ہے، ہر شخص اپنے کسی نہ کسی مسئلے میں الجھا ہوا ہوتا ہے۔ بڑے شہروں میں فاصلے جان لیوا ہوا کرتے ہیں۔ جب تک ڈاکٹر صاحب سمن آباد میں رہتے تھے ان سے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کی میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا تھا لیکن ای ایم ای کالونی میں جا کر وہ بہت حد تک تنہا رہ گئے اور آخری عمر میں ان کی زردحسی کا سبب یہی تنہائی تھی۔

☆☆☆☆☆

کباب نامہ

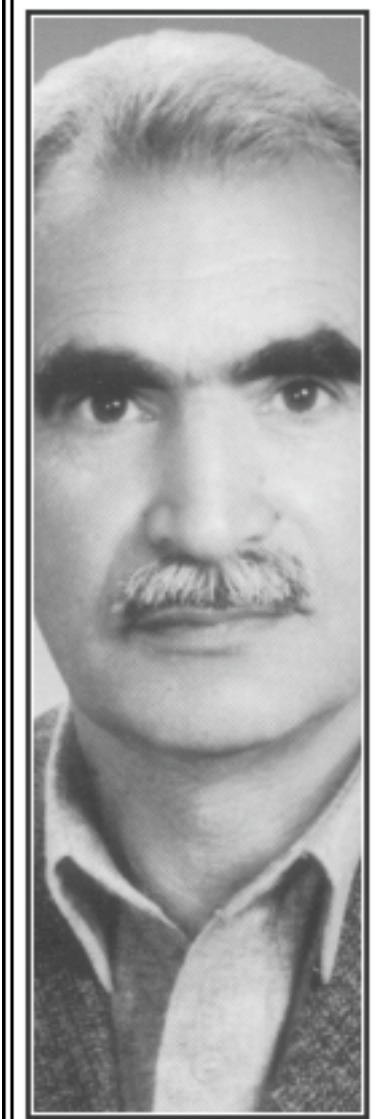

محمد ارشاد

بیاض (مارچ 2024) میں ہمایوں خان کی تحریر 'پشاور کے چپلی کباب' مجھے کئی دہائیاں پہلے کے ماضی میں لے گئی۔ پشاور کے چپلی کباب صرف پشاور کے نہیں پورے خیبر پختونخوا کے کباب ہیں۔ خیبر پختونخوا کا پرانا نام شمال مغربی سرحدی صوبہ تھا جو انگریزوں کا دیا ہوا نام تھا۔ جب اٹھارویں ترمیم کے بعد نام کی تبدیلی کی ضرورت پڑی تو ہری پور کے پیر صابر شاہ مشوانی نے پختونخوا کے ساتھ خیبر کا سابقہ بھی لگوا دیا حالانکہ اس وقت خیبر ضلع نہیں ایجنسی تھا۔ پورے خیبر پختونخوا میں کباب کو چپلی اور چپل کباب کوئی نہیں کہتا۔ معلوم نہیں یہ سابقہ کب اور کس ستم ظریف نے لگایا ہے۔ کباب صرف پشاور کی سپیشلٹی نہیں پورے پختونخوا کی ہے، جس میں ہزارہ کے وہ علاقے بھی شامل ہیں جہاں ہندکو بولی جاتی ہے۔ پشاور میں یوں تو ہر کہیں کباب اور کبابیوں کی دکانیں موجود تھیں اور ہیں لیکن جو شہرت نوتھیا کے کریمو کبابی اور اس کی وفات کے بعد اس کے شاگرد امین کبابی کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو پائی۔ کریمو اور امین اپنے کبابوں میں انڈے پیاز ٹماٹر وغیرہ استعمال نہیں کرتے تھے بل کہ ہڈیوں کی مخ یعنی گودا ڈالتے تھے۔ بظاہر پورا کباب ہوتا لیکن انگلی کی ہلکی سی ضرب سے ریزہ ریزہ ہو

جاتا۔ کریمو کے کباب کابل تک جاتے اور شاہی دسترخوان کی زینت بنتے میں اس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب افغانستان کا حکمران ظاہر شاہ تھا، جس نے کریمو اور امین کے کباب نہیں کھائے اس نے کباب کھائے ہی نہیں۔ پشاور میں بنگھم پارک کے سامنے جلیل کبابی کی بھی دکان تھی لیکن اس کے کبابوں میں انڈے پیاز ٹماٹر ڈالے جاتے تھے لیکن کباب شناس لوگوں کا کہنا تھا کباب میں انڈے ڈالنا بدمذاقی ہے۔ پشاور میں آج سے چند سال پہلے بخشی تلی کے کبابوں کا بہت شہرہ تھا لیکن ان میں پیاز ٹماٹر استعمال ہوتے تھے۔ معلوم نہیں اب بھی لوگ وہاں کباب کھانے جاتے ہیں یا نہیں کچھ مدت پہلے تاروجبہ (نوشہرہ) کے کبابوں کا شہرہ سنا لیکن اتنے بدمزہ کباب میں نے زندگی میں کبھی نہیں کھائے۔ ان سے کہیں بہتر کباب ہم (نوشہرہ) کے پائے۔ مجھے ذاتی طور پر کھانے پینے سے کبھی دلچسپی نہیں رہی لیکن میرا چھوٹا بیٹا کبابوں کا رسیا ہے۔ چونکہ ہم گھر کے چار افراد ہیں اس لیے گاڑی پورا پورا چلتا پھرتا گھر بن جاتی ہے۔ تخت بھائی کے کبابوں کی تعریف سنی تو وہاں لے گیا۔ شہباز گڑھی کے کبابوں کی تعریف سنی تو وہاں لے گیا۔ ہمایوں خان نے جن ماما کڑے، کاکا کڑے، بابا کڑے کا ذکر کیا ہے وہ سب یہیں ہیں ایک دوسرے کے پاس پاس ہونے کی وجہ سے شناخت اور امتیاز اور یادداشت کی خاطر یہ نام دیے گئے۔ کڑے سے مراد وہ کڑاہ (برتن) ہے جس میں کباب تلے جاتے ہیں۔ اس کا پیندا ہموار ہوتا ہے اور شکل میں گول ہوتا ہے اور کنارے دو تین انچ اونچے ہوتے ہیں۔ چولھے پر ترچھا رکھا جاتا ہے اور آگ اسی حصے کے نیچے جلتی ہے جس حصے میں کباب تلے جاتے ہیں باقی حصہ مٹی پر ہوتا ہے ہر کباب تلے جانے کے بعد وہیں منتقل کیا جاتا ہے تاکہ گرم رہے۔

ہری پور میں کباب کی متعدد دکانیں ہیں۔ کسی دور میں سب سے زیادہ مشہور مشوانی کباب کی تھی اور ایک بادہ کبابی بھی تھا۔ اب اس کا بیٹا یہ دکان چلاتا ہے۔ اس کے قریب کچھ دکانیں کبابیوں کی اور بھی ہیں۔ انھی میں سے اشک جہانزیب نامی ایک لڑکے کی بھی تھی جو پشاور کے کریمو اور امین کبابی کی طرح انڈے ٹماٹر نہیں ڈالتا تھا بلکہ ہڈیوں کا گودا استعمال کرتا تھا اور وہی لذت تھی جو کریمو اور امین کے کبابوں کی تھی۔ معلوم نہیں کس کی نظر لگی کہ جلدی ہی فوت ہو گیا۔ ایبٹ آباد کے کباب بہت بدمزہ ہوتے ہیں البتہ الیاسی مسجد کے قریب کے کباب بہتر ہوتے ہیں ایبٹ آباد اور مانسہرہ کے درمیان ایک جگہ قلندر آباد بھی ہے جہاں کباب کی متعدد دکانیں ہیں جن کے کباب خوردنی ہیں۔ پورے پختونخوا میں کباب سے مراد چپلی کباب ہیں نہ کہ سیخ کباب یا شامی کباب۔ شامی کباب وہاں وارد چیز ہے اور لوگوں نے حال ہی میں بنانے سیکھے ہیں۔ عید قربان پر غریب لوگ بھی یہی (چپلی) کباب بناتے ہیں۔ ہر کسی کے ہاں اتنا گوشت آ جاتا ہے

کہ ان کی بھی عید ہو جاتی ہے۔ اب تو لاہور (پنجاب) میں بھی آرائے بازار ڈاکخانہ روڈ پر کبابیوں کی کئی دکانیں وہاں آباد پشتونوں نے کھول رکھی ہیں لیکن ان کے کبابوں میں وہ مزہ نہیں جو ہونا چاہیے شاید آب وہوا کا اثر ہو یا پھر گوشت کا۔

پختونخوا کی خاص الخاص شے لنڈی کوتل کے تکے ہیں جنھیں شنواری قبیلے کے لوگ بناتے ہیں جن میں سوائے نمک کے کوئی چیز نہیں ہوتی شنواری لوگوں کو معلوم ہے کہ بوائلٹ کونسا ہے جب تکے نرم ہوتے ہیں اور اگر مزید آگ پر رہیں تو سخت وہ جاتے ہیں اور اگر پہلے اتار لیے جائیں تو کچے رہ جاتے ہیں۔ اب تو پشاور میں بھی نمک منڈی میں تکوں کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ جن میں سے زیادہ مشہور چرسی تکہ شاپ والوں کی ہے باہر سے آنے والے اسی پر ہجوم بنائے رہتے ہیں لیکن ان کے تکوں سے دنبے کے پیشاب کی بو آتی ہے اور ذائقے میں بھی شامل محسوس ہوتی ہے۔ اب تو سنا ہے کہ دوسری جگہوں پر بھی چرسی تکہ کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ اللہ روزی دینے والا ہے۔ اب تو ہری پور میں بھی شنواریوں کے نام سے کئی دکانیں کھل گئی ہیں لیکن شنواریوں کی نہیں عام پشتونوں کی ہیں جنھیں پتہ ہی نہیں کہ کس بوائنٹ پر تکوں کو آگ سے اتار لینا ہوتا ہے اور ذرا سا چھوڑا جائے تو تکے سخت ہو جاتے ہیں۔ لنڈی کوتل شنواریوں کا شہر ہے۔ وہاں کے تکے منہ میں رکھتے ہی کھل جاتے ہیں۔

کباب کھانے کا یوں تو کوئی خاص موسم نہیں لیکن سخت سردی اور بارش کے دنوں میں ان کی مانگ بہت بڑھ جاتی ہے۔ سال کے باقی ایام میں البتہ ان کی مانگ کم ہو جاتی ہے۔ اگر مہمان آجائیں تو سخت گرمی میں بھی ان کا دسترخوان پر ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کباب کے ساتھ چپل اور چپلی کا لفظ کس نے لگایا۔ پورے پختونخوا میں کباب کو چپل اور چپلی کباب کوئی نہیں کہتا سب صرف کباب ہی کہتے ہیں۔ چپل اور چپلی میں فرق یہ ہے کہ چپل Flif Flop قسم کا پیزار ہے اور چپلی پورے پاؤں کو ڈھانپتی ہے سوائے ایڑی کے جبکہ چپل پورے پاؤں کو نہیں ڈھانپتے گرمی میں پورے پاؤں کو ہوا لگتی رہتی ہے۔ ایک زمانے میں ایبٹ آباد کی چپلوں نے بڑی شہرت پائی اور پورے پختونخوا میں ایبٹ آباد سٹائل کی نقل کی جانے لگی آجکل چارسدہ کی چپلوں کا بول بالا ہے۔ ایبٹ آباد، ہری پور اور مانسہرہ میں چارسدہ چپل سٹور کھل چکے ہیں۔ سب سے اچھے چپل حضرو (ضلع اٹک) کا ایک کاریگر بناتا تھا جو ایک ہی Piece کمائے ہوئے چمڑے کے ہوتے تھے، کوئی میخ لوہا اور دھاگا استعمال نہیں ہوتا تھا ہلکے اتنے کہ معلوم ہوتا کہ کوئی چیز پہنی ہوئی نہیں ہے۔ غالباً اس کاریگر کے مرنے کے اب کوئی ہنرمند نہیں جو اس کے ہنر کی حفاظت کرتا۔

☆☆☆☆☆

جدید فکر و نظر کا شاعر.....میاں آفتاب

میاں آفتاب احمد کی کتاب جب میرے ہاتھ میں آئی تو سب سے پہلے میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، مجھے اس میں کافی کشش محسوس ہوئی۔ قد و قامت کے لحاظ سے وہ مجھے کسی بھی کتاب سے الگ کھڑی دکھائی دی۔ اس کے نام ''مختلف'' نے تو مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جہانِ شعر میں اس سے پہلے، میں نے آج تک یہ نام کبھی نہیں پڑھا اور نہ کبھی سنا تھا۔ لغت میں اس کے معنی جو بھی ہوں قبول۔ لیکن جب یہ لفظ لغت سے باہر آ کر اس کتاب کی پیشانی پر چسپاں ہوا تو مجھے اس میں حد درجہ وسعت نظر آئی۔ پھر جب میرے ذوق نے جوش مارا تو جھٹ میں نے اس کتاب کے کواڑوں کو، وا کر کے اسے عمیق نظری سے پڑھنا شروع کیا تو مجھے اس کتاب کے اندر سے جھانکتا ہوا ہر شعر معنی اور بنت کے لحاظ سے اپنے ہم عصروں سے قطعی طور مختلف لگا۔ کہتے ہیں کہ جو کتاب جتنی دل کش ہو گی وہ اتنی ہی قاری کو اپنی جانب کھینچے گی۔ کتاب ''مختلف'' بھی اس خوبی سے متصف ہے۔ اس لیے یہ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جیسے ہی یہ کتاب کسی قاری کے ہاتھ میں میں جائے گی تو وہ اسے اپنی پہلی ترجیح کے طور پر اپنے مطالعہ کی میز پر کسی نمایاں جگہ پر رکھے گا۔ اور موقع ملنے پر جب اسے اٹھا کر پڑھے گا تو وہ خود بہ خود اس کے معنی اور مفہوم کے سمندر میں اترتا ہی چلا جائے گا۔ نیز وہاں اسے جن اشاروں کنایوں اور تلمیحات سے واسطہ پڑے گا وہ اسے گونگے بہرے اور غیر مانوس محسوس نہیں ہوں گے بل کہ شور مچا کر یہ کہتے ہوئے ملیں گے کہ آؤ ہمارے قریب آؤ ہم سے باتیں کرو تا کہ تمھیں ہمارے اندر سے کسمساتے گرم جذبوں کا پتا چل سکے۔ نیز ہم سے جھوٹ موٹ کی دوستی استوار کر کے آگے مت پڑھنا بل کہ ہر شعر کے ساتھ سچا پیار نبھاتے ہوئے کچھ وقت اسی کے ساتھ رہنا پھر دیکھنا کہ اس میں برتی گئی علامتوں کے عقب میں کیسے نئی

حنیف باوا

سوچ، منفرد خیالات و آگہی کے نئے در وا ہوتے ہیں۔

یہاں پر میں زیرِ تبصرہ کتاب ''مختلف'' میں سے چند اشعار درج کرتا ہوں ہوسکتا ہے یہ میرے کیے ہوئے دعوے کی تصدیق کر سکیں:

ننھی سی لگ رہی ہے بظاہر، ہر دیے کی لو
یہ بھی نہ ہو اگر کہیں ، پھر بھی کچھ نہیں

کس کو درکار ہے یہ دولت غم
کس کو یہ میراث منتقل کروں میں

نہ اتنا جھوٹ بولو بے ارادہ
کہیں لب پر حقیقت آ نہ جائے

.....

میاں صاحب نے شعر کہتے وقت ایسے مشکل الفاظ کا سہارا نہیں لیا جنھیں سمجھنے کے لیے کسی اردو لغت کو کھنگالنا پڑے۔ انھوں نے تو اپنے شعر کو لفظوں کی ایک مہین سی چادر کی اوٹ میں رکھا ہوا ہے تا کہ ان تک پہنچنے کے لیے زیادہ تردد نہ کرنا پڑے بس اسی چادر کے کونے کو ذرا سا سرکائیں تو آپ کے سامنے وہ تمام شعری اوصاف آشکار ہو جائیں گے جنھوں نے اس شعر کو معنی خیز بنا دیا ہے۔

میاں آفتاب کے ہاں روایتی استعاروں یعنی گل و بلبل، قفس، قفس کی تیلیاں، رقیب، پیامبر، محبوب اور محبوب کی گلی کو خاطر میں نہیں لایا گیا۔ ہاں اگر کسی جگہ پر ان کا استعمال ناگزیر ہو گیا ہے تو ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں ہمارے اساتذہ سال ہا سال تک ان کے گرویدہ رہے ہیں، فیض احمد فیض نے بھی اکثر جگہوں پر ایسے الفاظ سے کام لیا ہے، لیکن اساتذہ کی جانب سے دیے گئے مفہوم کی یکسانیت سے گریز کرتے ہوئے انھوں نے ان الفاظ کو نئے معنی دیے ہیں۔ ایک جگہ مشہور سکالر ڈاکٹر غلام شبیر اسد، میاں آفتاب احمد کے ایسے اشعار جن کے معنی جامد نہیں کو توصیف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''معنی کے اعتبار سے میاں آفتاب کی غزل کے الفاظ still معنی نہیں رکھتے بل کہ، استعارات، تمثیلات تلمیحات اور علامات کے ذریعے مقامی معانی کو انسانیت کا رنگ دیتے ہیں۔ زیرِ نظر کلام کا شاعری مجلسی ضرور ہوتا ہے مگر ذاتی احساسِ ویرانی کو نہ تو کبھی سرِ محفل کہتا ہے اور نہ ہی سرِ کلام، بل کہ ذاتی دکھ کو استعاروں کی مدد سے آفاقی رنگ دینے میں ماہر ہیں۔''

ہمارے ملک پاکستان میں زیادہ تر حکمرانی آمروں کی رہی ہے۔ جنھوں نے آتے ہی سچ بولنے والے کی زبان اور سچ لکھنے والے کے قلم کو اپنی حکمرانی کے تابع رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ان کے قصرِ جبر و استعداد پر کچھ لرزا طاری کر سکتے ہیں تو وہ یہی لوگ ہیں۔ لیکن ان کی ہر کوشش ان کی زبان و قلم کو دبانے میں

ناکام رہی ہے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار کبھی کھل کر کبھی دبے لفظوں میں اور کبھی اشاروں کنایوں میں کرتے رہے ہیں۔ شاید انھیں نابغہ روزگار لوگوں کے لیے میاں آفتاب نے یہ شعر کہے ہیں:

لگاتا ہے وہی پہرے زباں پر
جو اذنِ لب کشائی دے رہا ہے
مقید کر رہا ہے مجھ کو احمد
بظاہر جو رہائی دے رہا ہے
مری لب بستگی کام آ گئی ہے
ہر اک لب سے بیاں ہونے لگا ہوں

.....

میاں صاحب کے یہ اشعار مزاحمت ادب کے زمرے میں بھی آتے ہیں لیکن ان کے ہاں کے کلام اور دوسرے مزاحمتی ادب میں واضح فرق یہ ہے کہ یہ ظلم و بربریت سے بہ راہ راست مخاطب نہیں ہوتا بل کہ ڈھکے چھپے الفاظ میں ان سے تکرار کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ بحر و حرف کو اشاروں اور کنایوں کی اوڑھنی اوڑھا کر، آمروں اور جابروں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اس اندازِ تخاطب سے میں سمجھتا ہوں ان حروف کی پزیرائی دو چند ہو جاتی ہے۔ مزاحمتی ادب تخلیق کرنے کا یہ رجحان ترقد پسند ادیبوں کے ہاں بھی بہ درجہ اتم موجود ہے۔ اس کی بڑی وجہ مذکورہ تحریک کا بنیادی منشور ہی مقتدر لوگوں کی جانب سے ڈھائے جانے والے مظالم اور ان پر روا رکھے جانے والی ناانصافیوں کے خلاف قلم اٹھاتا ہے۔ چنانچہ اسی منشور کے طابع رہ کر جو کچھ تخلیق کیا ہے اسے مزاحمتی ادب میں شمار کیا جانا چاہیے۔ اس ضمن میں ایسے بہت سے بڑے نام سامنے آتے ہیں، جنھوں نے اپنی تحریروں سے اردو زبان کو ثمر بار کیا ہے میں سمجھتا ہوں میاں آفتاب احمد نے ان کے نقش قدم پر چل کر مذکورہ بالا ایسے اشعار تخلیق کیے ہیں جو مزاحمتی ادب کی کسوٹی پر پورا اترتے ہیں۔

جب میں نے میاں صاحب کی کتاب ''مختلف'' بہ نظر غائر دیکھنے کے بعد اس کے ہر شعر کو پرکھا تو مجھے آفتاب جی اپنے ہم عصروں سے کچھ الگ جگہ پر دکھائی دیئے۔ مجھ پر یہ بھی عیاں ہو گیا کہ غزل کہنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں اس کے لیے بڑی جان لڑانی پڑتی ہے۔ اور مصرع تر کو قرطاس پر لانے کے لیے دن کو رات اور رات کو دن کرنا پڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے میاں آفتاب نے اس کتاب کو سامنے لانے کے لیے یہ تمام کٹھن منزلیں طے کی ہوں۔

آخر میں، میں یہ کہوں گا کہ اللہ کرے میاں صاحب کا قلم اسی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا آگے بڑھتا رہے اور ہمیں ایسے ہی اچھے اشعار پڑھنے کو ملتے رہیں۔ آمین

☆☆☆☆☆

برصغیر کی صوفی شاعرات: لللیشوری اور میرابائی

کشمیر نے بہت سے اولیا، عارف اور شعرا پیدا کیے جن میں لللیشوری (۱۳۲۰ء- ۱۳۹۲ء) ایک نمایاں حیثیت کی مالک ہیں۔ وہ بچپن سے ہی بہت سمجھدار اور مذہبی خاتون تھیں۔ کچھ لوگ انھیں محض ایک شاعرہ تصور کرتے ہیں، کچھ انھیں ایک مقدس خاتون کے روپ میں دیکھتے ہیں اور کچھ انھیں صوفیہ، یوگی یا شیو کی بھگت مانتے ہیں تاہم بعض انھیں اوتار کا درجہ بھی عطا کرتے ہیں لیکن ہر کشمیری انھیں کم از کم ایک عاقل عورت ضرور سمجھتا ہے۔ یوں تو کشمیری زبان اُن کے اقوال سے بھری پڑی ہے لیکن ہر کشمیری کی زبان پر لللیشوری کے کچھ اقوال ضرور پائے جاتے ہیں۔

وہ سرینگر کے جنوب مشرق میں کوئی سات کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تحصیل پندھور کے قصبہ پندرتھن (دھاندربن) کے متوسط درجہ کے ہندو زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ہندوستان میں اُس وقت علاؤ الدین خلجی کی حکومت تھی۔ خیال ہے کہ انھوں نے ضروری تعلیم اپنے والد سے گھر پر ہی حاصل کی۔ بارہ سال کی عمر میں ایک ہندو برہمن سے شادی ہوئی تو وہ پدماوتی کے نام سے اپنے سسرال آ گئیں لیکن ساس کے جبر اور شوہر کی عدم توجہی کا شکار رہیں۔ اُن کی ساس انھیں کئی کئی روز بھوکا رکھتی اور چاولوں کے نیچے بھاری پتھر رکھ کر دوسروں کو یہ تاثر دیتی کہ اُس نے اپنی بہو کو اچھی طرح کھانا کھلایا ہے۔ ایک مرتبہ اُن کی سہیلیوں نے دریافت کیا کہ وہ اُن کے ساتھ اپنے سسرال والوں کی دعوت میں شریک ہوگی تو لللیشوری نے کہا کہ چاہے وہ بھیڑ ہی کیوں نہ ذبح کریں، بہو کے لیے تو وہ یک بھاری پتھر ہی رہے گا۔ بعدازاں یہ جملہ ایک مشہور کشمیری محارہ ثابت ہوا۔

وہ اکثر دریا پار ایک قریبی مندر میں پوجا کے لیے جایا کرتی تھیں، کہا جاتا ہے کہ شوہر نے بے وفائی کے شبہ میں ایک روز غصے میں اُن کے سر پر رکھا ہوا پانی کا گھڑا توڑ دیا تو پانی گھڑے کی شکل میں اُن کے سر پر ٹھہرا رہا جب تک کہ برتنوں میں نہ انڈیل دیا گیا۔ چند بچ جانے والے پانی کے قطرے گھر کے دروازے سے باہر پھینکے جو جمع ہو کر ایک تالاب کی صورت اختیار کر گئے۔ اُنھوں نے چوبیس سال کی عمر میں سنیاس لیا، سسرال

خاور اعجاز

چھوڑ کر تصوف کی راہ اپنائی، شیومت کے گرو سدھاسری کانتھا کی شاگردی اختیار کی اور ایک خوش خرام مسافر کے روپ میں بستی بستی گھوم کر اُن لوگوں کو تعلیم دی جو قبول کرنے والے تھے۔ وہ دعویٰ کرتی تھیں کہ ابھی تک اُن کا سامنا کسی مرد سے نہیں ہُوا سو وہ برہنہ رہتی تھیں مگر جب شاہ ہمدان سے سامنا ہُوا تو کہا "مَیں نے ایک آدمی کو دیکھا؛ مَیں نے ایک آدمی کو دیکھا"۔ اِس سلسلے میں ایک کہانی یوں بیان کی جاتی ہے کہ جب للیشوری نے شاہ ہمدان کو دیکھا تو وہ قریبی نانبائی کے تنور میں کود گئی۔ نانبائی دنگ رہ گیا جب اُس نے للیشوری کو جلتے ہُوئے تنور سے سبز رنگ کے لباس میں ملبوس نکلتے دیکھا۔

تاریخ میں اُن کے مختلف نام آئے ہیں جیسے لل ایشوری، لالیشری، لال دی، لال دیدی، لال دیاد (دیاد بمعنی دادی)، لل دید، للہ یوگیشوری، للہ دید، للہ عارفہ، لل ماجہ لل ماجی (بزرگ خاتون) وغیرہ۔ اُن کے نام کا پہلا تذکرہ ۱۵۸۷ء میں ملا علی رینہ کے تحریر کردہ تذکرۃ العارفین میں ملتا ہے اور اُن کی منظومات کا اوّلین ترجمہ ۱۹۱۴ء میں سر جارج گریئرسن نے شائع کیا۔ للیشوری جس روشنی کی متلاشی رہیں وہ سچائی کا علم تھا اور اللہ تعالیٰ سے محبت کا سفر اُن کی واحد یاترا تھی۔ یہی وہ ذرائع تھے جنھوں نے للیشوری کو امتیازات کی زنجیریں توڑنے کی ہمت عطا کی۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ اُنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اِس روایت کی بنیاد مشہور صوفی بزرگ سید حسین سمنانی کی کشمیر آمد بتائی جاتی ہے جن کی ایما پر للیشوری نے اسلام قبول کر کے زندگی کا بقیہ حصہ عبادت الٰہی میں صرف کیا اور صوفیانہ شاعری کی جس میں انسان دوستی، اخوت، مساوات، بھائی چارہ، ہم آہنگی اور عدل و انصاف کا پرچار کیا۔ ہوسکتا ہے قبول اسلام کے بعد وہ للیشوری سے ملتے جلتے ناموں کے بجائے لل دید سے مشابہ ناموں سے پکاری جانے لگی ہوں۔ اُن کی وفات پر ہندو جلانا چاہتے تھے جبکہ مسلمان دفنانے پر مائل تھے لیکن جب چادر ہٹائی گئی تو وہاں پھولوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ تاریخ میں للیشوری کی باقیات یا مدفن کے بارے میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اُن کی شاعری کو "لل واخ" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ایک کشمیری ادبی صنف ہے جو کسی خاص بحر یا ترتیب کی تابع نہیں تاہم یہ تین سطروں پر مشتمل ہوتی ہے اور اردو گیت سے مشابہت رکھتی ہے۔ شاعری کی یہ صنف چودھویں صدی عیسوی کی مقبول لوک اصناف میں سے ہے جسے للیشوری نے کشمیری زبان میں اپنے صوفیانہ خیالات اور تجربات کی عکاسی کرتے ہُوئے عقیدتی شاعری کے طور پر استعمال کیا جو پُر زور، پُر جوش اور فلسفیانہ تھی۔ اگرچہ یہ زبانی شاعری کی روایت تھی تاہم نسل در نسل دانشمندی اور قوت عظمیٰ سے رابطہ کا ذریعہ فراہم کرتی رہی۔ اُن کی شاعری کو گرنتھ جیسی اہمیت دی گئی ہے۔ آغاز میں وہ صرف ہندو فلسفہ کے کشمیر شیومت صوفیانہ مکتب سے منسلک تھیں۔ اُنھوں نے سادھوؤں اور رشیوں

کی محافل میں بیٹھ کر معرفت اور شعور و آگہی کی منازل طے کیں۔ رفتہ رفتہ اُنھوں نے خود میں ایسی استعداد پیدا کر لی کہ زبان سے اکثر معرفت و حکمت کے کلمات جاری ہوتے۔ اُن کی منظومات کشمیری زبان کی ابتدائی تصانیف میں سے ہیں اور کشمیری ادبی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ اُن کی شاعری اور تعلیمات سے بعد کے آنے والے صوفیا بھی متاثر ہوئے بالخصوص شیخ العالم عرف نندرشی (۱۳۷۷ء-۱۴۴۰ء)۔

للیشوری کے کشمیری شبدھوں میں بعض مقامات پر فارسی الفاظ بھی در آئے ہیں جو اُس وقت فارسی زبان کی مقبولیت کا اعتراف ہے۔ اُن کی شاعری کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

Original Text

yi yi karu'm suy artsun

yi rasini vichoarum thi mantar

yihay lagamo dhahas partsun

suy Parasivun tanthar

اصل متن

یی یی کروم سوئے آرتسون

یی راسینی وچورم تھی منتر

یہے لگا مو دھاس پارتسون

سوئے پارسیوں تنتھر

English Translation

whatever work I did

became worship of the Lord;

whatever word I uttered became a prayer;

whatever this body of mine experienced became the sadhana of Saiva Tantra

illuminating my path to Parmasiva

اردو ترجمہ

مَیں نے جو بھی کیا وہ رب کی عقیدت بن گیا

مَیں نے جو بھی لفظ بولا وہ دعا بن گیا

میرے اِس جسم نے جو کچھ بھی تجربہ کیا وہ سیوا تنتر کی سادھنا بن گیا

جس نے پرماسیوا تک میرا راستہ روشن کیا

میرا بائی جی (قصبہ کُڈکی، ضلع پالی، ریاست جودھپور راجستھان ۱۴۹۱ء-۱۵۴۶ء دوارکا) بنت راجا رتن سنگھ راٹھور۔ پیدائشی نام جشودا راؤ تھا لیکن میرا بائی کے نام سے مشہور ہُوئیں۔ اُنھیں سَنت میرا بائی بھی کہتے ہیں۔ وہ راٹھور راجپوت شاہی خاندان کی فرد تھیں۔ سولھویں صدی عیسوی کے اوائل کی ہندو صوفی شاعرہ تھیں۔

۱۵۱۶ء میں اُن کی شادی اُن کی مرضی کے خلاف میواڑ کے ولی عہد رانا کمار بھوج راج (خلف رانا سانگا والیِ چتوڑ) سے ہُوئی جو ۱۵۱۸ء میں سلطنتِ دِلی (غالباً!

ابراہیم لودھی) کے خلاف جنگ میں زخمی ہو کر ۱۵۲۱ء میں فوت ہُوا۔ میرا کے والد اور سسر بھی خانوا کی جنگ میں مغل بادشاہ بابر سے شکست کے چند روز بعد ہی راہیِ ملکِ عدم ہُوئے۔ میرا خاندانی اور سماجی روایات کی قائل نہ تھیں جس کی وجہ سے للیشوری کی طرح وہ شوہر کی وفات کے بعد سسرال والوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنتی رہیں۔

اُن کا ذکر متضاد اور مختلف انداز میں متعدد لوک کہانیوں اور داستانوں کی زینت بنا۔ وہ کرشن کی عقیدت مند تھیں اور بھگوان کرشن کے بھگتی فرقے سے تعلق تھا۔ کرشن کی مدح میں میرا بائی سے ہزاروں بھجن منسوب ہیں جن میں سے چند سو ہی مستند خیال کیے جاتے ہیں جن میں سے دو چار کے علاوہ باقی سب اٹھارھویں صدی عیسوی میں ضابطہ تحریر میں آئے۔ میرا کے متعلق بنیادی ماخذ دستیاب نہیں اور اُن کے بارے میں جو کچھ جمع کیا گیا وہ ثانوی ذرائع سے حاصل شدہ ہے۔ للیشوری کی طرح میرا بائی کی وفات بھی ایک افسانہ ہے جس کے مطابق وہ کرشنا کی ایک مورتی میں ضم ہوگئی تھیں۔

میرا کی منظومات فلسفیانہ ہیں جن میں دُنیا سے عدم اطمینانی اور کرشنا سے جذباتی وابستگی کا اظہار ہے۔ علماٗ کی رائے میں میرا بھگتی تحریک کے مرکزی کرداروں میں سے ایک تھیں۔ اُن کی شاعری میں راجستھانی، برج بھاشا، اودھی اور گجراتی کے ملے جلے اثرات ہیں تاہم زیادہ تر شاعری راجستھانی زبان میں ہے۔ کہیں کہیں فارسی اور عربی الفاظ بھی در آئے ہیں۔ ادبی پنڈتوں کا کہنا ہے کہ میرا سے بڑی شاعرہ ہندوستان کی سرزمیں آج تک پیدا نہیں کر سکی، بعض علمانے تو اُن کو یونان کی سیفو پر بھی اس اعتبار سے فوقیت دی ہے کہ سیفو کا عشق جسمانی تھا جبکہ میرا کا عشق الٰہیاتی عناصر کے خمیر میں گندھا ہُوا ہے۔

میرا بائی کے مجموعۂ کلام
’’پریم وانی‘‘ سے انتخاب

جو مَیں ایسا جانتی کہ پیت کیے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت نہ کیجیو کوئے
ہے ری مَیں تو پریم دِوانی میرا درد نہ جانے کوئے
سُولی اوپر سیج ہماری، کس بدھ سونا ہوئے
نِس بار سو ہے بِرہ ستاوے کل نہ پرت پل موے ری
میرا کے پربھو ہری ابناسی مِل بچھڑ مت کوے ری
ایسی پریت لگی من موہن، جیوں سونے میں سہاگا
جنم جنم کا سویا منواں، ست گرو سبد سُن جاگا
کنکو ہیرا ایک سارسا، میرا کس کوں کہیے رے
ہیرا پن تو جدہی جانوں، مہنگا مول بکیے رے
آون کہہ گئے اجہوں نہ آئے دوس رہے اب تھوڑی
میرا کے پربھو کب رے ملوگے، ارج کروں کے جوری
سادھو سنت مہنت گیانی، کرت چلت پکار
داسی میرا لال گردھر، جیونا دن چار
صاحب کا گھر دُور ہے رے جیسے لمبی کھجور
چڑھے تے چاکھے پریم رس، پڑے تو چکنا چور
لاگے سوئی جانے ہو، کٹھن لگن دی پیر
وپد پڑے کوئی نکٹ نہ آوے، سکھ میں سب کو سیر

☆☆☆☆☆

معاصر پاکستانی غزل کے سات رنگ اور اکرم کنجاہی

معروف شاعر، نقاد اور محقق جناب اکرم کنجاہی کی تخلیقی و تحقیقی زرخیزی اور ہنرکاری کو جس قدر داد دی جائے کم ہے کہ وہ اپنی ہر آنے والی کتاب میں ادیبوں کے ساتھ ساتھ اپنے باذوق قارئین کو بھی اردو ادب کی ایک نئی جہت سے آشنا کرتے ہیں اور ان جہات میں جو تخلیق کار سرگرم عمل ہیں اُن کا بھی مکمل طور پر معروضی، تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ ہمہ وقت اُن کے پیشِ نظر رہتا ہے۔

راقم السطور تنقیدی سرگرمیوں کی نسبت سے اگر یہاں ان کی کتاب 'نسیم سحر کی تخلیقی دھنک' کا حوالہ نہ دے تو یہ ناشکر گزاری کے مترادف ہو گا کہ جناب اکرم کنجاہی نے حال ہی میں میری نظم و نثر کی کتب پر گزشتہ چند برس میں اپنے لکھے ہوئے تمام مضامین کو یکجا کر کے ''نسیم سحر کی تخلیقی دھنک'' کا خوبصورت عنوان دے کر شائع کر کے میری طویل ادبی خدمات کی تحسین و اعتراف کے ساتھ ساتھ مجھے مزید لکھنے کا حوصلہ بھی دیا ہے۔

خیر یہ بات تو برسبیلِ تذکرہ آ گئی، اس وقت مقصود ان کی تحقیق و تنقید پر مشتمل تازہ ترین کتاب ''معاصر پاکستانی غزل'' کا ذکر ہے جس کا ذیلی عنوان انھوں نے ''سات رنگ'' اس لیے رکھا ہے کہ اس کتاب میں عہدِ موجود کے سات قابلِ ذکر اور تخلیقی افق پر مسلسل چمکنے والے غزل گو شعرا کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ سات متغزلین رفیع الدین راز، فیض الحسن ناصر، ڈاکٹر فرحت عباس، یشب تمنا، نوید صادق، آفتاب خان اور آزاد حسین آزاد ہیں اور چونکہ ان سبھی شعرا کا کلام ان کی کتب کے علاوہ ادبی جرائد میں بھی راقم السطور کی نظروں سے گزرتا رہتا ہے اس لیے یہاں اکرم کنجاہی کو اس حوالے سے بھی داد دیتا ہوں کہ انھوں نے سات الگ الگ رنگ، اسلوب اور کیفیات کے حامل شعرا پر یہ کتاب لکھ کر اردو تنقیدی ادب کو سرفراز کیا ہے۔

اس کتاب کا ابتدائیہ بعنوان ''معاصر پاکستانی غزل'' بذاتِ خود اس موضوع پر ایک اہم مقالے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں وہ بجا طور پر کہتے ہیں کہ ہر عہد اپنے گزشتہ کی نسبت جدید ہوتا ہے اور جدیدیت کی حقیقی تعریف یہی ہے کیونکہ بلاشبہ کوئی تخلیق کار ادب کی جمالیاتی اقدار کو سماجی قدروں سے کتنا بھی الگ کر کے پرکھے، ادب اپنے عہد میں رونما ہونے والی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر ہی آگے بڑھتا ہے۔ چنانچہ اکرم کنجاہی اس بیانیے سے یہ نتیجہ اخذ

نسیم سحر

کرتے ہیں کہ ”کسی بھی شاعر کے کلام کا عمیق مطالعہ اس کے ہاں عصری شعور کو ضرور واضح کر دیتا ہے۔ ہر تخلیق کار کا اپنا ایک غالب رنگ ضرور ہوتا ہے جو اس کی پہچان بن جاتا ہے“۔

جناب اکرم کنجاہی نے عہدِ موجود کے سات شعرائے کرام کو اپنے تنقیدی افکار و نظریات کی روشنی میں پرکھا ہے اور عرق ریزی سے معاصر غزل کے خدوخال ان کی شاعری میں تلاش کیے ہیں، اس لیے وہ جہاں بجا طور پر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ”اس کتاب میں جن سات متغزلین پر مفصل بات کی گئی ہے وہ اپنے اپنے فکر وفن کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعین کی دوری پر نہ سہی مگر اُن کے غزلیہ اوصاف کافی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ذائقے سے آشنا ضرور کرتے ہیں“۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مطالعے کی روشنی میں معروف نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی کا ایک فکر انگیز اقتباس پیش کر کے بات یہاں ختم کی ہے کہ اس ممتاز نقاد کی دور رس نگاہوں نے مابعد جدیدیت کی پھوٹتی ہوئی کونپلیں محسوس کر لی تھیں، اور انھوں نے جن خصوصیات کی جانب واضح اشارہ کیا تھا وہ ہمارے عہد کی غزل اور متغزلین سے متعلق ہیں“۔

تو قارئینِ کرام، آیئے ہم بھی ذرا ان سات معاصر متغزلین کے متنوع تخلیقی رویّوں اور ذائقوں سے جناب اکرم کنجاہی کی تنقیدی آراء کی روشنی میں مستفید ہو سکیں۔ مضمون کو طوالت سے بچانے کے لیے جناب اکرم کنجاہی کے سات مضامین میں سے صرف وہی مختصر حصے مقتبس کیے جا رہے ہیں جو ان سات شعرا کے بنیادی تخلیقی رویّوں اور نظریات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ہر شاعر کے دو شعر بھی اقتباس کے آخر میں پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ دعوے کے ساتھ ساتھ دلیل بھی شامل ہو جائے۔

۱۔ رفیع الدین راز:

(رفیع الدین راز کی فکری جہات کا سیر حاصل احاطہ کرتے ہوئے مصنف رقم طراز ہیں کہ)

راز صاحب نے اپنے عہد کے مسائل کا بیان نہایت سلیقہ مندی اور درد آمیزی سے کیا ہے۔ اس سے غزل کی موضوعاتی رنگارنگی میں بھی بے انتہا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے غزل میں آفاقی اور کائناتی مسائل کو بھی جگہ دی ہے۔ ان کے ہاں ذات، حیات اور کائنات کے حوالے سے غور و فکر کا عمل نظر آتا ہے اور پیچیدہ مسائل کے حوالے سے کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔

کھول بھی دے اب نگاہوں پر طلسمِ کائنات
ان ستاروں سے ہمیں تو کب تلک بہلائے گا

.....

تخلیقِ کائنات کا محور ہے میری ذات
فطرت کی ایک ایک ادا ہے مرے لیے

۲۔ فیض الحسن ناصر:

فیض الحسن ناصر کی غزل کا انتقادی جائزہ لیتے ہوئے اکرم کنجاہی لکھتے ہیں کہ شعر گوئی فیض الحسن ناصر کے نزدیک محض مسرت و انبساط کشید کرنے اور وقتی لطف اندوز ہونے کا نام

نہیں ہے بلکہ اس کے ارفع و اعلیٰ مقاصد ہوتے ہیں۔ یوں وہ ادب کی مقصدیت کے قائل نظر آتے ہیں۔۔ان کے ہاں علامتوں یا لفظی و شعری ترکیبوں کے اعتبار سے تو کوئی اختراع نہیں ہے مگر انھوں نے پنجابی اور انگریزی کے کچھ الفاظ کو اپنے الفاظ کا حصہ ضرور بنایا ہے جو لسانی تشکیلات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

سیلاب کے خطر میں رہیں گے نشیبی شہر
سجتی رہیں گی محفلیں بالائی شہر میں

.....

ہم نے جس جس کو پاسباں جانا
اس نے دیوار و در اُکھاڑ دیے

۳۔ ڈاکٹر فرحت عباس

ڈاکٹر فرحت عباس کو فکری اعتدال و توازن کا شاعر قرار دیتے ہوئے اکرم کنجاہی لکھتے ہیں کہان کی غزل میں مرصع کاری ہے نہ ہی صناعی، اس میں دِقت پسندی ہے اور نہ ہی کوئی ابہام کی صورت پذیری ہے، مگر تہہ داری بھی ہے اور معنی آفرینی بھی، ہنرمندی بھی ہے اور نازک خیالی بھی، ان کی غزل ایک طرف تو روایت اور کلاسیت کا تسلسل ہے، قدیم طرز کی پاس داری ہے تو دوسرے طرف آفاقی موضوع کو آفاقی سوچ کے مطابق نکھرے ہوئے ذوق کے ساتھ پیش کیا ہے:

زندگی کے لباسِ خستہ میں
دھوپ میں ہم برہنہ سر بھٹکے

.....

غلّہ اٹھا کے آج بھی چلتا بنا امیر
فاقوں کی زد پہ گاؤں کا دہقان رہ گیا

۴۔ یشب تمنا

لندن میں مقیم شاعر یشب تمنا کا مجموعۂ کلام ''تاریک دنوں کی کہانی'' ایک کیفیت اور خاص تناظر میں کہا گیا کلام ہے جو اُن کی ذہنی و فکری کیفیت اور حساسیت کا عکاس ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم جس سیاسی و معاشی ابتری کے دائرے میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں اُس میں ''تاریک دنوں کی کہانی'' میں شامل کلام ہر پاکستانی کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہے۔

شاخوں سے اُڑ رہے ہیں پرندے یہ سوچ کر
اِس باغباں کو فکرِ چمن اب نہیں رہی

.....

کھیل کے سارے کھلاڑی اس سے باہر ہو گئے
چال اِک ایسی چلی ہے اجنبی کردار نے

۵۔ نوید صادق

نوید صادق سادہ اسلوب اور قدرے پیچیدہ فکر و خیال کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری محبت کے ابتدائی اور سطحی نوعیت کے عمومی خیالات سے ورا ہے، مگر خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے افکار کو ثقیل یا نامانوس الفاظ کے نیچے دبنے نہیں دیتا۔ سادہ الفاظ میں معنوی تہہ داری اس کا خاصہ ہے۔ اس کا تخلیقی رویہ ایک منجھے ہوئے ہنرمند کا ہے۔ اس نے موضوعی رجحانات سے زیادہ اثرات قبول کیے ہیں اور اسی بنیاد پر اس نے اپنا تخلیقی انفراد قائم کیا ہے لیکن اسے رومانی خیالات نے بھی متاثر ضرور کیا ہے۔

جو زیست ہار گئے ان کو تو خبر ہو گی
تمام شہر کو لاحق مرض دوام کا تھا

.....

بکھیر خاک مری ہر طرف، جہاں تک ہو
اور اس کے بعد مجھے چاک پر دوبارہ بنا

۶- آفتاب خان

آفتاب خان بیدار حسیت اور آگہی کا شاعر ہے۔ اس کی غزل شعور و ادراک کی بصیرت و بصارت اور گہرے احساس کی تہہ داری کا امتزاج سامنے لا رہی ہے۔ اُسے احساس ہے کہ نئی نئی لفظیات فکر کی ترسیل اور تفہیم میں بہت اہم ہوتی ہیں اور زبان و بیان میں نہ صرف لطافت و نزاکت پیدا کرتی ہیں بلکہ غزل کو معنویت کی کئی سطحوں سے آشنا کرتی ہیں۔ وہ لفظ کو علامت اور خوبصورت تخلیقی ترکیبوں میں ڈھالنے کے فن سے واقف ہے۔ اس کی غزل کا بنیادی مزاج رومانوی ہے اور کئی مقامات پر تراکیب کی موزونیت نے غزل گوئی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈھال بن جائے جو سب ظالم بلاؤں کے لیے
گھر میں اک بوڑھا ضروری ہے دعاؤں کے لیے

.....

پیدا ہوا ہے نقص معیشت میں اس طرح
مخمل پہ سونے والے بھی لیٹے ہیں گھاس پر

۷- آزاد حسین آزاد

''انفراد'' کے خالق آزاد حسین آزاد نے اپنی قوتِ اظہار کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف عمدہ غزل تخلیق کی ہے بلکہ انفرادیت بھی قائم کی ہے۔۔ الفاظ اس کا وہ منشور (پرزم) ہیں جو فکر و خیال کے ہفت رنگ صفحۂ قرطاس پر بکھیر رہے ہیں۔ محبت، زندگی اور اس کے متعلقات کو دیکھنے کا زاویہ فکر اپنی جگہ لیکن یہ ایک شاعر کی حیثیت سے اس کی افتادِ طبع اور شعری مزاج بھی بن چکا ہے کہ وضع الفاظ، لفظی و شعری اضافتوں اور ترکیبوں کے ذریعے افکار کی ترسیل اس طرح کی جائے کہ لطافت، نزاکت اور تاثر مترشح ہو۔

ہم ایسے خود رو درخت، ایندھن ہیں زندگی کا
ہمارے جیسوں کا سانس لینا بھی لکڑری ہے

.....

ہجر بھی لے ہی لیا دشت کے آزار کے ساتھ
بحث کیا کرتا میں البیلے دکاں دار کے ساتھ

.....

اکرم کنجاہی کی تنقیدی نظر گزشتہ کئی عشروں سے پاکستانی ادب کی تمام جہات پر مسلسل جمی رہتی ہے چنانچہ معاصر پاکستانی غزل کی نسبت سے یہ کتاب جہاں ایک طرف ہمیں درجِ بالا سات شعرا کی تخلیقی جہات، لفظیات، موضوعات اور اسالیب سے کماحقہٗ آگہی فراہم کرتی ہے وہیں اس عہد کے مجموعی تخلیقی رویوں سے بھی شناسا کرتی ہے۔ اور یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اکرم کنجاہی کا متوازن تنقیدی رویہ انہیں اپنی بات بڑے سلیقے اور تہذیب کے ساتھ کرنے پر مائل رکھتا ہے وہ کہیں بھی کوئی ایسا لفظ نہیں لکھتے جو اپنے ممدوح یا قارئین کی نفاستِ طبع پر گراں گزرے۔

☆☆☆☆☆

(اسّی اور نوّے کی دہائی میں)

لاہور کا نعتیہ منظرنامہ

مجھے یاد ہے بچپن میں لاہور کے قدیم علاقہ مزنگ میں جب ہم بابا عبداللہ شاہ قادریؒ کے دربار سے ملحق مسجد چاہ جھنڈی جاتے تو جمعہ کے روز امام صاحب کے خطبے سے پہلے اعلیٰ حضرت احمد رضا خان رضا کی نعتیں پیش کی جاتیں اور نماز کے بعد انہی کا شہرہ آفاق سلام مصطفیٰ جانِ رحمت مل کر پیش کیا جاتا۔

جبکہ ہمارے گھر کی فضا:

سلام اے آمنہ کے لال، اے محبوبِ سبحانی

اور

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

.....

یعنی حفیظ جالندھری صاحب اور مولانا ظفر علی خان صاحب کی ان نعتوں سے مہکا کرتی۔

میں نے تب تک اعلیٰ حضرت کا دیوان حدائقِ بخشش نہیں پڑھا تھا حالاں کہ وہ والد صاحب قبلہ یزدانی جالندھری کے ذاتی کتب خانہ کا حصہ تھا جس میں قابلِ ذکر کلاسیکی اور جدید شعرا کے لگ بھگ سبھی دیوان موجود تھے۔ ان کے کمرے کی الماریاں کتابوں اور رسالوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بڑی الماری کے سب سے اوپر والے خانے میں قرآنِ پاک کے نسخے سجے تھے۔ ان کے نیچے احادیثِ مبارکہ اور تاریخ کی کتب رکھی تھیں اور ان کے نیچے دینی شاعری کے مجموعے جن میں نعتیہ مجموعے زیادہ تھے۔

والد صاحب امام بوصیریؒ کا قصیدہ بُردہ، مولانا روم کی مثنوی، شیخ سعدی شیرازی اور مولانا جامی کا کلام بہت شوق سے پڑھتے۔ اردو میں محسن کاکوروی، اعلیٰ حضرت احمد رضا خان رضا، امیر مینائی، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، حفیظ جالندھری، ماہر القادری اور صبا اکبر آبادی جیسے شعرا کی نعتیں انھیں بے حد پسند تھیں۔

والد صاحب کا شعری رجحان ہمارے بچپن میں تو غزل گوئی ہی کی جانب زیادہ تھا یا پھر آزاد نظم کہتے تھے۔ گھر میں جو ادبی جرائد اعزازی طور پر باقاعدہ موصول ہوتے ان

حامد یزدانی

میں سے الوارث، سیارہ، ضیائے حرم اور فاران میں نعتیں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں۔ نعتیہ موضوعات پر مضامین بھی ہوتے تھے۔ کبھی کبھار ان میں والد صاحب کی نعتیں بھی چھپتی تھیں۔

نعت گوئی کی طرف زیادہ رجحان ان کا ستر کی دہائی میں ہوا جب انھوں نے ریڈیو پاکستان لاہور کے ایک نعتیہ مشاعرہ میں یہ نعت پیش کی:

اسلوبِ حمد ، نعتِ پیمبر کا فن ملے
درویشِ بے نوا کو بھی اذنِ سخن ملے

امّی لقب سا کوئی اتالیق اب کہاں
رفتارِ کائنات میں جس کا چلن ملے

بطحے کی خاکِ پاک سے یزدانی حزیں
مجھ کو بھی آفتابِ رُخِ پختن ملے

.....

سبحان اللہ۔۔۔ کیسی قبولیت کی گھڑی تھی وہ کہ جس کے بعد ان کا قلم تاعمر ثنائے آقاؐ کے لیے وقف ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے مختصر نعتیں کہیں، طویل نعتیہ قصیدے لکھے اور ایک دلآویز نعتیہ مثنوی بعنوان ''صبحِ سعادت'' تخلیق کی۔ ادبی جرائد میں باقاعدگی سے ان کا نعتیہ کلام شائع ہوتا رہا اور لاہور کیا لاہور سے باہر سے بھی نعتیہ محافل میں شرکت کی دعوتیں ملنے لگیں۔ ریڈیو، ٹی وی کے مشاعرے ہوں یا مقامی ادبی تنظیموں کی نعتیہ محافل لاہور کے سبھی اہم شعرا ان میں شریک ہوتے۔ میں بات کر رہا ہوں ستر کی دہائی کے اواخر اور اسی کی دہائی کے اوائل کی جب پاکستان بھر میں دینی شاعری خاص کر نعت کے فروغ کے سلسلہ کا شان دار آغاز ہوا تھا۔ اس فضا کی تشکیل میں اس دور کے اربابِ بست و کشاد نے بھی اہم کردار ادا کیا جو ملکی ماحول کو اسلامی رنگ میں رنگ دینے کا عزم کیے ہوئے تھے۔ سرکاری ذرائع ابلاغ تو اس میں پیش پیش تھے ہی غیر سرکاری اداروں اور اخبارات و جرائد نے بھی اس بابرکت تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ نعتیہ مجموعے تواتر سے چھپنے لگے۔ روزناموں کے دینی صفحات بھی نت نئی نعتوں سے آراستہ ہوتے۔ ادبی جرائد نے خصوصی نعت نمبر شائع کیے۔ خالد شفیق صاحب کی ادارت میں رسالہ ''شامِ سحر'' کا نعت نمبر ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ تعلیمی اداروں کے میگزینز نے بھی سیرت یا نعت نمبر شائع کیے۔ لاہور کی شاید ہی کوئی ادبی تنظیم ایسی ہو جو ربیع الاول کے مہینے میں نعتیہ محفل کا اہتمام نہ کرتی ہو۔ حتیٰ کہ حلقہ اربابِ ذوق لاہور بھی نعتیہ مشاعرہ ضرور منعقد کرتا۔

ڈاکٹر تبسم رضوانی کی مجلسِ شمعِ ادب کی محافل نیلا گنبد انارکلی کے پاس ہوتی تھیں۔ انارکلی ہی میں ایک مشاعرہ اہلی والا تکیہ میں ہوا کرتا تھا۔ مجلسِ اردو کے مشاعرے دلّی

دروازے کے باہر واقع شاہ محمد غوث لائبریری میں منعقد ہوتے تھے۔ اسی طرح لاہور کینٹ اور ماڈل ٹاؤن کے شعرا اپنی اپنی نعتیہ محافل الگ سے سجاتے تھے۔ لاہور میں نعتیہ مشاعروں کا ایک سلسلہ راجا رشید محمود اور منیر قصوری صاحب نے بھی مل کر شروع کیا تھا جس کے ابتدائی مشاعرے بھائی گیٹ ہائی سکول میں ہوئے۔ یہ وہی سکول ہے جد کو منہدم کرنے بعد ازاں حضرت داتا گنج بخش علیؒ ہجویری کے دربار کے احاطے میں شامل کرلیا گیا۔ واصف علی واصف صاحب نابھہ روڈ پر واقع اپنے نجی تعلیمی ادارے میں مشاعروں کا انعقاد وقتاً فوقتاً کیا کرتے تھے۔

ریلوے روڈ لاہور پر تاج کمپنی کی عمارت میں تو پہلے ہی سے سالانہ نعتیہ مشاعرہ کی روایت قائم تھی۔ اسی مشاعرہ میں میں نے بھی پہلی بار اپنی نعت پیش کی تھی جس کا مطلع تھا:

مرے لب پر رسولِ پاک کا جب نام آتا ہے
نظر ہوتی ہے روشن، روح کو آرام آتا ہے

.....

مشاعرہ میں موجود اساتذہ نے خوب حوصلہ افزائی کی تھی۔ یہی ان کا طریق کار تھا۔ محبت سے شاباش دیا کرتے تھے۔

ان سالانہ مشاعروں سے ہٹ کر کچھ انجمنیں ایسی بھی تھیں جو ہر ماہ نعتیہ شعری نشستوں کا اہتمام کرنے لگی تھیں جن میں مجلسِ سیرت کے یادگار مشاعرے مجھے کبھی نہیں بھولتے جن میں سینئر شعرا کے ساتھ ساتھ نوآموز شعرا کو بھی کلام سنانے کا موقع دیا جاتا۔ مجلس سیرت کی انتظامیہ میں حفیظ تائب، علیم ناصری، خالد بزمی اور عابد نظامی شامل تھے۔ یہاں جن شعرا کو میں نے سنا ان میں احسان دانش، عبدالعزیز خالد، یزدانی جالندھری، نظیر لدھیانوی، حافظ امرتسری، حافظ لدھیانوی، جعفر بلوچ، حفیظ الرحمٰن احسن، تحسین فراقی، نقش ہاشمی، انور فیروزپوری، خالد شفیق، حسرت حسین حسرت، حسرت امرتسری، صحرائی گورداسپوری، عباس مرزا، اقبال دیوانہ، یونس حسرت، قمر یزدانی، راز کاشمیری کے ساتھ ساتھ خالد علیم، محمد احمد شاد، زبیر نازش، یعقوب پرواز اور کتنے ہی عمدہ شعرا شامل تھے۔

ان مجالس میں سُنے کچھ اشعار تو ہمیشہ میرے حافظے کا حصہ رہے۔ مثلاً:

احسان دانش صاحب کی نعت کا شعر سماعت ہو
دانش ہم درویشِ نبی ہیں، واقفِ لطفِ تشنہ لبی ہیں
سجدہ پیہم، شکر دمادم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حفیظ تائب صاحب اردو نعت کی سربرآوردہ شخصیت ہیں۔ ان کی نعت کے یہ اشعار دیکھیے کیسے خوب صورت ہیں:

وہ ہادی جہاں جسے کہیے جہانِ خیر
نسبت سے اُس کی میرا وطن ہے نشانِ خیر

تائب نگاہِ رحمتِ عالم سے بن گیا
ہر مصرعِ ثنائے نبی ترجمانِ خیر

انجم رومانی ایک استاد شاعر تھے۔ ان کا اندازِ اظہار بہت منفرد تھا۔ کہتے ہیں:

اک عشقِ مصطفیٰ ہے اگر ہو سکے نصیب
ورنہ دھرا ہی کیا ہے جہانِ خراب میں

لاہور کے ادبی ماحول کی ہر دل عزیز شخصیت جعفر بلوچ کا آہنگِ نعت بھی ملاحظہ ہو:

میں حرف کم نما سہی بیاضِ شوق کا مگر
مرا سیاق دیکھنا، مرا سباق دیکھنا

جو اک جھلک سی دیکھنی ہو محفلِ رسول کی
نجوم و ماہتاب کا کبھی وفاق دیکھنا

حافظ صوفی محمد افضل فقیر کے کلام کا رچاؤ اور ان کا پڑھنے کا انداز دونوں اپنا رنگ لیے ہوئے تھے۔:

یوں دیکھتے ہیں روضۂ اطہر کو اہل دل
گویا جنابِ سرورِ عالم ہوں سامنے

سرکار کی نگاہِ کرم ہے فقیر پر
سرکار کی ثنا جو لکھی ہے غلام نے

عارف عبدالمتین کو بھی اسی دور میں نعت سے شغف پیدا ہوا اور ایسا ہوا کہ ان کی زندگی کی روش بدل کر رہ گئی۔ وہ ایک دور میں دہریے مشہور تھے مگر اب اس خشوع و خضوع سے نعت کہنے لگے تھے کہ محفل کی فضا گرما کر رکھ دیتے تھے۔ بہت ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتے تھے:

میں اپنے شام و سحر تیرے نام کرتا ہوں
کہ وقت کوئی ہو تجھ سے کلام کرتا ہوں

شرف ملا ہے اِسے تیرے پاؤں چھونے کا
میں آسمان کا بھی احترام کرتا ہوں

.....

سہ ماہی جریدہ ''سیارہ'' کے مدیر حفیظ الرحمٰن احسن کی نعت کا حسن کچھ یوں کھلتا ہے:

ہے روشن جس کا سینہ سر بسر نورِ نبوت سے
وہی تو ہے دریچے روشنی کے کھولنے والا

وہ آہنگِ حقیقت دینے والا حرف و معنی کو
وہ بس وحیِ الٰہی کی زباں میں بولنے والا

پروفیسر خالد بزمی نہ صرف باقاعدہ نعت کہتے بلکہ ہر اہم نعتیہ مشاعرہ میں شرکت بھی فرماتے۔:

کسی انساں کی عظمت اس سے بڑھ کر کیا ہوا ے بزمی
خدا نے آپ کے اخلاق پر خود ناز فرمایا

ماہنامہ اہلِ حدیث کے مدیر بزرگ شاعر علیم ناصری صاحب اسلامی ادبی محافل کی رونق تھے۔ اقبال کا آہنگ انھیں بہت تھا۔ ان کی نعت کے یہ اشعار دیکھیے جو اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ والی بحر میں ہیں:

نقطۂ اقرا ہے وہ، مرکزِ اسرا ہے وہ
شرحِ الف لام را، رمزِ الف لام میم

میرے نبی کا خدا خالقِ کون و مکاں
میرے خدا کا نبی حاملِ خُلقِ عظیم

پروفیسر تحسین فراقی بھی اسلامی ادب کے فروغ میں علمی طور پر ہمیشہ پیش پیش دکھائی دیئے۔ تحسین فراقی کہتے ہیں:

آنکھیں سبز ہرے گنبد کی روز تلاوت کرتی ہیں
ہم کو اِذنِ حضوری دے کر حضرت اور اعزاز کریں

اُس دور کے نوجوان شاعروں میں خالد علیم کو خاص مقام حاصل تھا۔ وہ نعت تواتر سے کہتے اور بہت عمدگی سے کہتے:

آپ کا ذکرِ مبارک لب بہ لب، شاہِ عرب
آپ کی توصیف ہے وجہِ طرب، شاہِ عرب

عمر بھر کرتا رہوں میں آپ کی مدحت رقم
اس سے بڑھ کر کچھ نہیں میری طلب، شاہِ عرب

.....

ہم اسی اور نوے کے عشروں کی بات کر رہے ہیں تو ہجری صدی کی تبدیلی کے تاریخی واقعہ کو کیونکر نظر انداز کر سکتے ہیں جس نے ملک بھر کی طرح لاہور کی نعتیہ فضا کو بھی ایک نئے موڑ سے آشنا کیا۔ یوں جیسے وقت نے کروٹ لی ہو اور سارا ادب یکا یک نعت رنگ سا ہو گیا ہو۔

ہم نے دیکھا کہ نئی ہجری صدی کے آغاز پر تو فروغِ نعت کی سرگرمیوں میں اور بھی جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ اس موقع پر کئی تازہ نعتیہ مجموعے شائع ہوئے، کئی نعتیہ انتخابات سامنے آئے۔ نعت کے متنوع موضوعات پر تحقیقی مقالے تحریر کیے گئے۔ سیرت کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ کتابوں پر اعزازات و انعامات کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ انھی دنوں لاہور میں سیرت مشن کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا جس کے سرپرست رفیق اشرفی صاحب تھے اور ان کے ساتھ حفیظ تائب اور راز کاشمیری جیسے مخلص نعت گو شعرا مہتمم تھے۔ سیرت مشن کا ماہانہ مشاعروں کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ مشاعرہ کے اختتام پر منتخب نعت گو شاعر کو حج یا عمرہ کا ٹکٹ دیا جاتا۔ اس ضمن میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے حفیظ تائب صاحب نیاس دور کے لگ بھگ دو سو زندہ شعرا کا منفرد اور منتخب کلام ''بہارِ نعت'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا جو اب ایک حوالہ کی شے بن چکا ہے۔ جناب راز کاشمیری کی مرتب کردہ کتاب ''صلی اللہ علیہ وسلم'' میں ماضی اور حال کے دو سو کے قریب شعرا کی وہ نعتیں شامل کی گئیں جن کی ردیف صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھی۔ یہ کتاب بھی اپنی مثال آپ تھی اور اس کی اشاعت کا اہتمام سیرت مشن نے کیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ والد صاحب جناب یزدانی جالندھری کی نعتیہ مثنوی ''صبحِ سعادت'' کی اشاعت کا اہتمام بھی سیرت مشن کے تحت ہی ہوا تھا۔ اس نعتیہ مثنوی کا تفصیلی تعارف کبھی الگ سے کرواؤں گا۔ ان شاء اللہ

اس نعتیہ مثنوی کا آغاز حمدِ رب تعالیٰ سے ہوتا ہے

اور پھر آغازِ حیات اور روئے ارضی کی صورت حال، انبیائے کرام کی بعثت اور اس کے نتائج اور پھر حضور ختمی مرتبت کی تشریف آوری اور اس کے بے بہا ثمرات کا شعری بیان ہے۔ اس میں صلوٰۃ وسلام کے جو اشعار شامل ہیں وہ بھی انتہائی دل کش اور ایمان افروز ہیں۔

میں پورے اعتماد و وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اسی اور نوے کی دہائیئے اردو ادب کو نعتیہ شاعری کا جو قیمتی سرمایہ عطا کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ اتنا وقیع اور متنوع کام ہمیں اس سے پہلے کسی ادبی عہد میں نہیں ملتا۔ کیسے کیسے عمدہ اور صاحبِ اسلوب شعرا تھے اور کیسے کیسے اعلیٰ پیرایہ ہائے اظہار — سبحان اللہ۔

مثلاً ہمہ جہت ادیب و شاعر اور جریدہ فنون کے مدیر احمد ندیم قاسمی فرما رہے ہیں:

قطرہ مانگے جو کوئی تو اسے دریا دے دے
مجھ کو کچھ اور نہ دے اپنی تمنا دیدے
تب سمیٹوں میں ترے ابرِ کرم کے موتی
میرے دامن کو جو تو وسعتِ صحرا دیدے

نعتیہ قصائد کے مجموعے ''تشبیب'' کے شاعر خالد احمد کہتے ہیں:

خلق میں انساں تھا لیکن خُلق میں قرآن تھا
وہ کہ سرتا پا جمالِ سورہ رحمان تھا

سطرِ خاتم تھا خدا کے آخری فرمان کی
سلکِ تسبیحِ رُسُل کا آخری مرجان تھا

قتیل شفائی یوں تو گیت اور غزل کے شاعر کے طور پر شہرت رکھتے ہیں تاہم ان کی نعتیں بھی لائقِ توجہ ہیں:

کب کہا مجھ کو تاجِ شاہی دے
عشقِ احمد مجھے الٰہی دے

رات جب بھی کہوں میں نعتِ رسول
تھپکیاں بادِ صبح گاہی دے

ممتاز شاعر مظفر وارثی کہتے ہیں:

بشر ہے وہ یا کلامِ باری، میں اُس کی ہر اک ادا کا قاری
تمام قرآن کی جو تصویرِ معنوی ہے، وہی نبی ہے

اعظم چشتی نعت گو بھی تھے اور نعت خواں بھی۔ ان کی نعت کے دو شِ:

سینہ آئینۂ الم نشرح
دل خدا کی امانتوں کا مقام

تو بھی اعظم غبارِ رہ بن جا
چاہتا ہے اگر حضورِ دوام

منیر نیازی کی وجہِ شہرت ان کی غزلیں اور نظمیں سہی مگر ان کی نعت میں بھی ایک دل کشی موجود ہے۔ نعت میں جدید رنگ متعارف کروانے والے اس شاعر کی نعت کے دو شعر:

مثالِ قوسِ قزح بارشوں کے بعد نکل
جمالِ رنگ اِنہی منظروں سے پیدا ہو

فروغِ اسمِ محمد ہو بستیوں میں منیر
قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو

نعیم صدیقی اسلامی ادب کے حوالہ سے نعیم صدیقی صاحب کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔انھوں نے تعمیری اور اخلاقی ادب کے پودے کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ان کا نعتیہ کلام دیکھیے:

ابھی غار میں، ابھی بدر میں، ابھی فرش پر، ابھی عرش پر
کبھی وہ ادا، کبھی یہ ادا، کبھی وہ جھلک، کبھی یہ جھلک

وہ جو تو نے خُم سے مرے لیے کوئی چاندنی سی انڈیل دی
ہے کئی صدی کا یہ واقعہ، مرے جام میں ہے ابھی چمک

واصف علی واصف کی نعت:

سُرمگیں چشم آہوئے مازاغ
زلف واللیل، والضحیٰ چہرا
عالمِ خواب میں حقیقت ہے
آپ کا چہرہ، آپ کا چہرہ

خورشید رضوی کہتے ہیں:

شان اُن کی سوچیے اور سوچ کر رہ جایئے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے

سونپ دیجے دیدہ تر کو زباں کی حسرتیں
اور اس عالم میں جتنا بن پڑے رو جایئے

استاد ذوق کے سلسلہ سے شعری اور نسبی نسبت رکھنے والے اور احسان دانش کے شاگرد خاص شاعر ذوقی مظفر نگری کی نعت کا ایک شعر:

شر کے شعلے عشق کی تہنی کو چھو سکتے نہیں
خیر کا فردوس ہے خیرالورا کی آرزو

شہزاد احمد کی نعت کا آہنگ ملاحظہ ہو:

ہر ایک سمت سے آتی ہے تیری ہی خوشبو
ہر اک زمانہ، زمانہ ترے جمال کا ہے

مجھے خبر ہے کہ سارے زمانے تیرے ہیں
یہ تذکرہ کسی ماضی کا ہے نہ حال کا ہے

اختر حسن جعفری کی طرز مدحت:

وہ نرم لہجے میں بولتا تھا
تُنک مزاجوں کی سلطنت میں بتایا جس نے
دعا کے لہجے میں بات کرنا
مکاشفے میں، مباحثے میں، مباحلے میں
دلیلِ قاطع، دعائے فاتح، ثبوت آخر کو اپنے
اوزان کی صداقت میں تولتا تھا
وہ نرم لہجے میں بولتا تھا۔

آخر میں میں بس یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میری یہ تحریر کوئی تحقیقی مقالہ ہے اور نہ موضوعاتی محاکمہ۔ آپ اسے ایک یادنامہ کہہ سکتے ہیں یا پھر منظر نامہ۔ وہ منظر نامہ جو میرے ذہن کے البم کے صفحات پر عکس عکس محفوظ ہے اور جس کے نقوش میری تخلیقی دنیا کے ہر ہر راستے پر ثبت ہیں۔

☆☆☆☆☆

شہرِ فکر کا مسافر: نوید صادق

ذہن اور دل اگرچہ دونوں ایک واحدے کا جزو ہیں لیکن بنیادی فکر کے اعتبار سے حقیقت تک پہنچنے کے لیے دو مختلف راستے ہیں۔ دونوں کا جہاں الگ ہے۔ ایک جذب تو دوسرا مشاہدہ و تجربہ کی طرف رو کشاں ہے۔ گویا دونوں منفرد حیثیت و نوعیت کے حامل ہیں۔ دونوں کا مدعا ایک ہے مگر کائنات، کیفیات، اشیاء کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے لیے دونوں کا انداز منفرد ہے۔ اس تناظر میں بنیادی فلسفہ رب کائنات کا تصور ہے۔ جوں جوں ہم فکر و احساس کے دو مختلف راستوں پر نکلتے ہیں تو ہمیں الگ الگ جہانوں کی سیاحت نصیب ہوتی ہے اس طرح ہم درونِ ذات کے سفر میں ہر دو مذکورہ اعضا کے افعال کی مغائرت کی وجہ سے ہر دوسرے فریق سے دور چلے جاتے ہیں جو درحقیقت ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر انسانیت کے قدم ڈگمگائے ہیں خدائے سخن نے دوئیت فکر کو کس طرح باہم کیا ہے قابلِ توجہ ہے:

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

.....

نوید صادق چوں کہ شہرِ فکر کا باسی ہے اس لیے اس کی غزل میں اس طرح کے معاملات کا در آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے جو شعر سنانے جا رہا ہوں ممکن ہے ان معنوں میں نہ دیکھا گیا ہو، جس فکر کے جلو میں اسے پڑھتے جا رہا ہوں

علی دانش

لیکن سامعینِ فکر توجہ کے لیے شعر کی لفظیات کی طرف توجہ لاؤں گا کہ یہاں ''دل'' اور ''گھر'' باہم ایک دوسرے کے لیے استعاراتی تبدّل لیے کھڑے ہیں نوید صادق نے دو متوازی کناروں کو، بہ یک وقت، دستِ فکر کی گرفت میں لے لیا ہے:

دل کو تری طرف سے کوئی واہمہ نہیں
اس گھر میں ایک ہم ہیں، کوئی تیسرا نہیں

.....

نوید صادق جہانِ فکر کا مسافر اس لیے ہے کہ اس نے فلسفہ اور نظری مکالموں میں سے گزرتے ہوئے اپنی ہست کے پرنکالے ہیں اور انھیں کے بل بوتے پر وہ غزل میں الگ اسلوب کا حامل ہوا ہے۔ نوید صادق کے بولتے ہوئے لہجے میں اس کا سکوت بھی نمایاں ہے یہ سکوت اس کے گہرے تفکّر سے جڑا ہوا، ناگفت کا آمیزہ ہے۔

اپنی بات کی دلیل میں جو شعر پڑھنے جا رہا ہوں اس کی لفظیات کے پس منظر سے، یعنی دوسرے مصرع میں سے جھانکتا ہوا جبر، جو ذات کی پہنائیوں تک اُتر گیا اور اشتراکِ زیست کا عمل بھی صاف دکھائی دے رہا ہے لیکن پہلا مصرع نوید صادق کے فہم اور مزاج کے فکری نظام کا اشارہ ہے:

چُنی تھی درمیانی راہ ہم نے
عقائد پر بھی سمجھوتا ہوا تھا

جس اہم نکتہ کی طرف میں احباب کی توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ نوید صادق کا وہ توانا فکری نظام ہے جو تصورِ خدا کا انفراد لیے ہوئے ہے اس لیے کہ فکر کے اس شہر میں یہ موڑ بہت اہم ہوتا ہے اور اسی کی بنیاد پر اشیا کو دیکھنے اور پرکھنے کے پیمانے وضع کیے جاتے ہیں اس حوالہ سے شعر دیکھیے:

خدا نے آخری آواز دی تھی
میں اپنی سمت دوڑا آ رہا تھا

.....

یہاں سکوت و گفت کے مابین جو لمحۂ فکریہ ہے وہ فکر یہ ہے کہ وہ صرف ایک لفظ کے فاصلے پر کھڑا ہے اور اسی نے رخشِ بدن کو مہمیز کیا ہے۔ وہ لفظ ہے ''اپنی''۔ کہ یہی وہ لفظ جس نے شعر کے تکنیکی مرکزہ میں معنی خیزی کو پرافشاں کیا ہے۔ سامعینِ خوش فکر کے لیے اس شعر کی قرأت بارِدگر سمجھتا ہوں:

خدا نے آخری آواز دی تھی
میں اپنی سمت دوڑا آ رہا تھا

.....

میں نہیں سمجھتا کہ دو الگ راستوں کے مسافروں کو راہِ مدّعا سے گزرنے میں کچھ اختلاف ہو اس لیے کہ یہ وہ آئینہ ہے جس میں ہر دو اپنا چہرہ بہ خوبی پہچان سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں نہ تو ہم نوید صادق کو

Agnosticism کا پیرو مان سکتے ہیں اور نہ یہ ان کی فکری Athelsm کی طرف رجوع کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تاہم یہ فکر بدھا کے شونیہ کی طرح فلسفیانہ سکوت کا شکار بھی نہیں ہے۔ نوید صادق کے تصور خدا کا بہتا ہوا فکری دھارا، پیچیدہ گفتاری سے ہوتا ہوا ایک ایسے مقام پر بھی پہنچ جاتا ہے جہاں ایک خوش آئند مثبیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ تخلیق خالق کی نفسیات کو سمجھنے سے قاصر ہے لیکن جہاں تک اس گنجلدار بھجارت کی ایک پرت کو کھولنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں احادیث، قرآنی آیات، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خطبہ توحید کی روشنی میں دیگر بہت سے صوفیا و اکابرین کے اقوال کی عبارتیں رب کائنات کی رحمت کے غلبہ کی دلیل بن کر سامنے آجاتی ہے۔ نوید صادق نے شعر کی صورت میں جس نفسیات تجزیہ کو حسن و بیان کی سطح تک پہنچایا ہے میرے لیے قلبی تسکین کا سامان ہے شعر ملاحظہ ہو:

میرے خدا کا مسئلہ
کوئی بہت بڑا نہیں

.....

نوید صادق جس شہرِ فکر کا باسی ہے وہاں کے چاک جگر کا رفو اتنا آساں بھی نہیں ہے یہاں تو سوزن زباں کی علمیت سے ارتباط کی گرہ لگانی پڑتی ہے۔ یہ وہ دشتِ خار نہیں ہے جہاں مجنوں یا سودا کا گزر ہوا البتہ تشکیک اس نگر میں جون کو اپنا پیش رو بنا سکتی ہے ایک طویل غزل شاعر نے جون کی نذر کی ہے لیکن تشکیک یقین کی پیش رو نظر نہیں آتی۔

تجھ سے آگے کی کوئی تمثیل ہوں
اے صدائے رائے گاں ، افسوس میں
کچھ نہ تھا تو کم سے کم میں تھا کہیں
اے خدائے ہر زماں ، افسوس میں

.....

نوید صادق جس شہر کا باسی ہے وہاں تصور خدا کے بعد جو اہم ترین مسئلہ درپیش ہے وہ تصور زماں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی غزل ایسے اشعار سے زیادہ دور نہیں ہے جہاں وقت، اشیاء کی قدر کا تعین کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ فکر کے اس نگر میں البرٹ آئن سٹائن نے General Theory of Relativity پیش کی۔ کہ جب کوئی مادہ کائنات میں جس قدر مقدار کے ساتھ موجود ہوتا ہے وہ Space Time کے ساتھ ساتھ Curve کرتی ہے یعنی سکڑتی ہے آئن سٹائن کے اس انکشاف نے زمین پر موجود فزکس کے علم کی بنیادیں متزلزل کر

دی کہ روشنی ہمیشہ سیدھا سفر کرتی ہے۔
دوسرے لفظوں میں ہم ایک ستارے کو
جہاں دیکھ رہے ہوتے ہیں اگرچہ وہ
سورج کے پیچھے موجود ہوتا ہے لیکن
Space Time کے سکڑنے کی وجہ
سے اس جگہ پر نظر آتا ہے جہاں وہ موجود
نہیں ہے:

قرطاسِ دل زار پہ یہ نقشِ شکستہ
وہ کون تھا جس نے مجھے دیکھا نہیں دیکھا

دوسرے لفظوں میں روشنی Space
Time کی سکڑنے کی وجہ سے اس کمی کو
پورا کر دیتی ہے جو اپنی اصل جگہ پر موجود
نہیں ہوتی:

چپ چاپ ادھر ادھر گیا ہوں
میں اپنی کمی سے بھر گیا ہوں

آئن سٹائن نے Time and
Motion کا نظریہ پیش کیا کہ جب ہم
زمیں کے قریب آتے ہیں تو وقت کی رفتار
کم ہو جاتی ہے لیکن جب ہم زمین سے
دور جاتے ہیں تو وقت کی رفتار لامحالہ بڑھ
جاتی ہے۔

اے وقت میں تیری مملکت سے
کچھ تیز نہیں گزر گیا ہوں

دوسرے لفظوں میں Frame of
refeence تیزی سے حرکت کرتا ہے تو
وقت کی رفتار کم ہو جاتی ہے اور جب فریم
آف ریفرینس آہستہ ہوتا رہے تو وقت کی
رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

تھک ہار کر نوید مرے دائیں ہاتھ پر
کاسہ بہ دست وقت مری نیند سو گیا

نوید صادق وہ ستارہ خاک ہے جسے ایک الگ
دُنیا کی تلاش ہے کوئی اسے زبان کے
برتاوے میں دیکھنا چاہتا ہے تو کوئی خیال کی
تازہ کاری میں، کوئی تشبیہ کی ندرت میں دیکھنا
چاہتا ہے اور کوئی استعارہ کے نئے تناظر میں
مگر وہ تو کسی اور ہی پریشانی میں گھرا ہوا ہے
اس کا روگ دوسروں سے منفرد ہے۔ دراصل
اسے اپنے لیے کسی اور ہی جہان کی تلاش ہے:

یہ روگ مرے فکر کی تجسیم کرے گا
سورج نے مرے شہر کا نقشہ نہیں دیکھا

دل کا نگر الگ ہے فکر کا نگر الگ۔ دل کا نگر تو ہر
شاعر نے آباد کیا ہے۔ دل کا نگر جذب سے
آباد ہوتا ہے لیکن فکر کا نگر نظریوں اور فلسفوں
سے آباد ہوتا ہے کائنات کی الجھی ہوئی گتھیوں
کو سلجھانے کی جدوجہد کا بیڑا اٹھانے کے لیے
رت جگوں کا وفور یہ چشم مضطرب رہتا ہے اور

اس اضطراب کے لیے سرمایہ جاں کو جلانا پڑتا ہے
اپنے کیے ہوئے فیصلے پر نوید صادق کو کوئی ندامت نہیں ہے اسی لیے وہ بلا تأمل پکار اٹھتا ہے:

تم راکھ سمیٹنے کی سوچو
میں آگ سے کھیلنے چلا ہوں

.....

نوید صادق نے جس شہرِ فکر میں ،خیمہ لگایا ہے وہاں کی فضا اس کے لیے غیر مانوس ضرور ہے اگرچہ اسے یہاں کے باسیوں سے زیادہ توقعات نہیں ہیں لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ضرور ہے جو اس کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے لیے بہت کافی ہے:

کچھ تو کہیں گے ہم سے پرندے ،ہوائیں، پھول
ہم نے نواحِ شہر میں خیمہ لگا لیا

.....

نوید صادق نے جو کام کیا ہے بہت سے شعرا سے مختلف ہے ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو اس کا یہ انفراد بھلا نہ لگتا ہو اس لیے کہ جب میں اپنے کمرے میں آتا ہوں مجھے اپنی کتابیں اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی لگتی ہیں یہ مسئلہ میرے لیے زیادہ پریشانی کا باعث نہیں ہے میں سمجھتا ہوں کہ میرے کمرے میں پڑا ہوا پیپر پیڈ، قلم ،کاغذ یا کچھ بھی جس بے ترتیب میں پڑا ہے ہے میرے لیے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے لیکن یہی بے ترتیبی میری بیٹی کے لیے ایک اور مسئلہ ہے اور اس کی نظر میں ہر آنے والے مہمان کی نظر سے باہم آمیز ہو کر یہ مسئلہ اور بھی گمبھیر ہوتا چلا جائے گا بالکل اسی طرح نوید صادق کے شعری تجربہ اور مسئلہ کو سمجھنے کے لیے ایک خاص مزاج اور فکر کی ضرورت ہے انسان، اس کا ماحول، جبر و قدر، معیار، زمین، شعری تجربہ اور مسئلہ کو سمجھنے کے لیے ایک خاص مزاج اور فکر کی ضرورت ہے انسان، اس کا ماحول، جبر و قدر، معیار زمین، آسماں، فرشتے، خلا، وقت، انسانی رویے، رب کائنات اور کائنات کے دیگر سربستہ رازوں میں انسانی فکر کی الجھی ہوئی گتھیاں اور مسائل ہیں جو نوید صادق کے لیے واقعی الجھن کا باعث ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ تمام موضوعات اس کی شاعری میں ایک فکری منطقہ کی حیثیت رکھتے ہیں یوں تو یہ سب کچھ ثابت کرنے کے لیے مجھے نوید صادق کی کتاب میں سے بہت سے مزید شعر منتخب کرنے پڑھتے لیکن میں سمجھتا ہوں اگر میں اپنے موقف پر زیادہ غلط نہیں تو مجھے نوید صادق کی طرف سے آخر میں صرف ایک ہی شعر پڑھنا چاہیے جو اس کے شہرِ فکر کی ترجمانی کرنے کے لیے بہت کافی ہے:

میں شہر میں اجنبی نہیں ہوں
اک شخص مجھے بھی جانتا ہے

☆☆☆☆☆

کتاب اور صاحبِ کتاب

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے وہ مضامین جو مختلف اوقات میں رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے، ان میں سے چند مضامین ''تاثراتی اور تنقیدی تحریریں'' کی صورت میں پیش خدمت ہیں۔

استاذ الاساتذہ جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا اسمِ گرامی علم و ادب کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، ان کی شخصیت متنوع جہات کی حامل ہے۔ وہ ایک باکمال ماہر تعلیم، بلند پایہ محقق اور نقاد ہونے کے ساتھ ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں۔ درس و تدریس سے ان کی وابستگی نصف صدی سے زائد عرصے کو محیط ہے۔ وہ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے بیسیوں مقالات کی نگرانی کر چکے ہیں۔ انھوں نے غیر ملکی طلبا کی بھی ایک کثیر تعداد کو سالہا سال اردو زبان سے روشناس کرایا۔ اسی سلسلے میں وہ پیکنگ یونیورسٹی (چین) اور جاپکا (جاپان) میں بھی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ بلا مبالغہ آج ان کے ہزاروں تلامذہ دنیا بھر میں اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کا تعلیمی و تدریسی سفر قابل رشک ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے طلائی تمغے سے لے کر حکومتِ پاکستان کی جانب سے تمغۂ حسن کارکردگی تک مختلف اعزازات ان کی بے مثال علمی و ادبی خدمات کا اعتراف ہیں۔

بعض لوگ اچھے استاد ہوتے ہیں، لیکن دفتری امور کے ماہر نہیں ہوتے اور بعض جگہ صورت حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ خواجہ محمد زکریا کا خاصا یہ ہے کہ وہ مسائل دفتر اور مذاق سخن دونوں کے ساتھ بہ احسن نباہ کرنے والے قابل تقلید لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایک طویل عرصہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر نشین رہے۔ پھر پرنسپل اورینٹل کالج کے مناصب پر بھی فائز رہے۔ بلاشبہ وہ ایک کامیاب استاد ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجے کے منتظم بھی ہیں۔ ان کا دور قرض شناسی اور دیانت داری سے عبارت ہے۔ چنانچہ آپ کے وسیع تجربے اور گراں قدر علمی ادبی خدمات کے پیشِ نظر پنجاب یونیورسٹی نے پروفیسر ایمریطس کے طور پر آپ کی خدمات دوبارہ حاصل کیں اور تاریخ ادبیات کی تدوین نو کا کام بھی آپ کے سپرد کر دیا۔

آصف علی چٹھہ

دراصل پنجاب یونیورسٹی نے 1972 میں ''تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' 14 جلدوں میں شائع کی تھی۔ اس کی پانچ جلدیں اردو ادب پر تھیں۔ اب ایک عرصے سے اس کی ترتیب و تدوین نو کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی انتظامیہ کا حسن انتخاب قابل داد ہے کہ اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے خواجہ صاحب سے درخواست کی گئی۔ آپ نے جس عرق ریزی، جانفشانی اور قلیل مدت میں اس منصوبے کو بحسن و خوبی پایہ تکمیل تک پہنچایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اب نہ صرف اردو ادب کی پانچ جلدیں اضافہ کے بعد، چھ ضخیم جلدوں کی شکل میں سامنے آئی ہیں، بلکہ ان کی ایک تلخیص بھی منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ شنید ہے کہ حصہ فارسی پر بھی آپ ہی کی زیر نگرانی کام شروع ہو رہا ہے۔ آپ کی یہ ادبی کاوش انتہائی قابل ستائش ہے۔

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کا احیا بھی خواجہ محمد زکریا کی تگ و دو کا ثمر ہے۔ جب آپ کو اکیڈمی کے جنرل سیکرٹری کی ذمہ داری تفویض ہوئی تو یہ نیم سرکاری ادارہ نیم جان تھا آپ کی مسلسل محنت اور کوشش سے اسے حیات نو میسر آئی ہے۔ آپ کے آنے کے بعد کتب کے اشاعتی معیار، رفتار اور فروخت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ آپ یہ خدمت بغیر کسی مشاہرے کے سرانجام دے رہے ہیں۔ مادی ترقی اور حلب زر کی دوڑ کے اس عہد میں ایسی مثالیں بہت کم یاب ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی وجہ سے یہاں علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہیں۔ لہٰذا اب یہ ادارہ صحیح معنوں میں ایک ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔

ہر کجا چشمۂ شیریں بود
مردم و مرغ و مور گرد آیند

خواجہ محمد زکریا کا تحقیقی و تنقیدی سرمایہ معیار اور مقدار ہر لحاظ سے وقار اور اعتبار کا حامل ہے۔ آپ کے ایم اے اور پی ایچ ڈی کے مقالات بالترتیب ''اردو میں قطعہ نگاری'' اور ''اکبر الہ آبادی۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' کے نام سے داد تحقیق پا چکے ہیں۔ اگرچہ ان موضوعات پر اس کے بعد مزید کام بھی سامنے آ چکا ہے۔ لیکن آج بھی اہل علم اخذ و اکتساب اور استناد کے لیے آپ کی کتب ہی سے رجوع کرتے ہیں۔ اکثر پر آپ کی دوسری کتاب ''نثر اکبر الہ آبادی'' بھی تحقیق کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ البتہ اکبر پر آپ کا تخصیص ایک مستند ''کلیات اکبر الہ آبادی''

کی ترتیب وتدوین کا متقاضی ہے اور یہ کام آپ سے بہتر شاید اور کوئی نہیں کر سکتا۔

آپ کی مرتبہ ''کلیاتِ داغ''، ''کلیات حفیظ جالندھری''، کلیاتِ عدم'' اور بالخصوص ''کلیاتِ مجید امجد'' اردو ادب پر ایک احسان ہے - آپ کی ان کاوشوں کے باعث آج اردو ادب کے قارئین کو ان اہم شعرا کے مستند متون دستیاب ہیں- البتہ مجید امجد کے فکر وفن پر ایک مفصل کتاب کا ابھی شدت سے انتظار ہے-

خواجہ محمد زکریا قدیم وجدید شاعری پر کس قدر گہری نظر رکھتے ہیں اس کا اندازہ آپ کی مرتبہ ''قدیم نظمیں''، ''قدیم اصناف شعر''، ''انتخاب زریں- اردو غزل'' اور ''انتخاب زریں- اردو نظم'' دیکھ کر ہوتا ہے- انتخاب زریں کے نام سے اردو شاعری کا یہ انتخاب اہم شعرا کے مختصر کوائف اور مستند کلام پر مشتمل ہے- یہ انتخاب ہر اعتبار سے لائقِ صد تحسین ہے-

''چند اہم جدید شاعر'' اور ''نئے پرانے خیالات'' آپ کے متفرق تنقیدی مضامین کے دو مجموعے ہیں- یہ تنقیدی، تحقیق اور تاثراتی مضامین آپ کی تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں-

خواجہ محمد زکریا ''اقبالیات'' سے بھی خصوصی لگاؤ رکھتے ہیں- اس سلسلے میں ان کی چار کتب ''شرح بانگِ درا''، ''اقبال کا ادبی مقام''، ''اقبالیات - چند نئی جہات'' اور ''تفہیم بال جبریل'' اقبال شناسی کی روایت میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں-

خواجہ محمد زکریا نے زمانہ طالب علمی سے شعرو شاعری کا آغاز کر دیا تھا اور کالج کے زمانے میں جھنگ کے معروف شعرا میں شمار ہوتے تھے- احسان دانش نے بھی ''جہانِ دگر'' میں لکھا ہے ''جناب زکریا جب جھنگ میں تھے، بڑی اچھی غزلیں کہتے تھے- جہاں انھیں مضمون نگاری میں یدطولیٰ حاصل ہے وہاں ان کی غزلیں بھی معیاری غزلوں کی صف میں آتی ہیں-'' بہرحال تحقیقی وتنقیدی مصروفیات کے باعث شاعری کا حوالہ پس منظر میں چلا گیا- اب ان کی شاعری کا نقشِ اول ''آشوب'' منظرِ عام پر آچکا ہے- ''آشوب'' نظموں، غزلوں، رباعیات اور متفرق اشعار پر مشتمل ہے اور عہدِ حاضر کی ایک نہایت سچی اور کھری تصویر ہے- تائید کے لیے صرف ایک شعر کافی ہے-

حکمراں جب چپ رہیں اک دوسرے کے ظلم پر
اہل دانش اس کو کہتے ہیں بقائے باہمی

.....

زیرِ نظر مجموعہ مضامین میں خواجہ محمد زکریا کے تین طرح کے مضامین شامل ہیں - چند

مضامین تعارفی تاثراتی ہیں، بعض خالص تنقیدی و تحقیقی اور بعض دونوں کا مجموعہ ہیں۔ ان تمام مضامین کی مشترک خوبی یہ ہے کہ یہ اعتدال، توازن اور صاف گوئی کے آئینہ دار ہیں۔ شخصیات پر لکھتے ہوئے تو یہ التزام اور بھی قابل داد ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شخصی مضامین کے عنوان ہی اتنے بلیغ ہیں کہ پوری شخصیت عنوان ہی میں سمٹ آتی ہے۔ مثلاً ''شیر افضل جعفری_ جھنگ کا قلندر'' یا ''جعفر طاہر۔ گلِ خاردار'' وغیرہ۔

''ان کی تنقید واضح ہوتی ہیں۔ بات کو دوٹوک انداز میں کہتے ہیں لیکن ان کے ہاں جو وضاحت ہے اس کی تعریف کیے ہی بنتی ہے۔ وہ بات کو گھما پھرا کر کہنے کے عادی نہیں۔ ان کے ہاں یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی غلط نہیں ہے، جیسی قابل رحم تنقیدی نہیں ملتی۔''

خواجہ زکریا کی مندرجہ بالا رائے سید عابد علی عابد کے طرز انتقاد کے بارے میں ہے لیکن غور کریں تو خود ان کا رنگِ نقد بھی انھی خصوصیات سے متصف ہے آپ ان ناقدین میں سے نہیں ہیں جو حتیٰ الامکان کوشش کرتے ہیں کہ:

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

وہ کسی بھی مصنف یا ادب بارے کے بارے میں مبہم اور غیر یقینی رائے کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ان کے بے لاگ تبصرے تشکیک کی راہیں مسدود کر دیتے ہیں۔ آپ کو ان کے ہاں رومانی انداز کی جملہ سازی نظر نہیں آئے گی۔ سچ ہی ہے کہ ان کی شخصیت کی طرح ان کی تحریریں بھی واضح، شفاف اور ابہام سے پاک ہیں۔ ایسی ہی تحریروں کی تعریف کرتے ہوئے والٹر سیویج لینڈر (Walter Savage Landor) نے لکھا تھا کہ شفاف لکھنے والے مصنفین شفاف چشموں کی مانند اتنے گہرے دکھائی نہیں دیتے جتنے کہ وہ اصل ہوتے ہیں۔ گدلے چشمے زیادہ گہرے نظر آتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے جملہ تنقیدی و تحقیقی سرمائے میں شفافیت امتیازی شان کی حامل ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید کی ''امتزاجی تھیوری'' کے مطابق نقاد کسی ایک تنقیدی زاویے سے لیس ہو کر تخلیق کی طرف متوجہ نہ ہو کیونکہ ایسی صورت میں وہ اتنا ہی آسمان دیکھ پائے گا جتنا کہ اُسے اپنی کھڑکی میں سے دکھائی دے گا۔ نقاد کو اپنے پورے وجود کے ساتھ تخلیق کی طرف آنا چاہیے۔ خواجہ محمد زکریا کی تنقیدات بھی اس بات کو بین ثبوت فراہم کرتی ہیں وہ کسی خاص عینک سے ادب کو دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ افکار و افکار کو من و عن قبول کرنے کے بجائے جملہ تنقیدی

زاویوں سے فن پارے کا بغور جائزہ لیتے ہیں اور شاعر یا ادیب کو کلیت میں دیکھتے ہوئے اپنی رائے کا بے لاگ اظہار کرتے ہیں۔

علوم اخذ و اکتساب ہی کے باعث ترقی کی منازل طے کرتے ہیں لیکن کسی خاص نظریے کی طرف ضرورت سے زیادہ جھکاؤ سے سطحیت اور عدم توازن کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

خواجہ محمد زکریا کا خاصا یہ ہے کہ وہ جدید و قدیم تحریکوں، علوم اور تھیوریوں سے حد درجہ آگاہی کے باوجود کسی خاص نظریے سے مرعوب نہیں ہوتے اسی لیے ان کی تحریریں ایک انضباط، تعمق اور توازن کی آئینہ دار ہیں۔ وہ دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے جابجا مغربی دانش وروں کے اقتباسات بھی درج نہیں کرتے لیکن ان کے وسعت مطالعہ اور ژرف نگاہی نے ان کی تنقید میں گہرائی اور گیرائی کی خصوصیت کو بہت نمایاں کر دیا۔

خواجہ محمد زکریا حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کو تنقید جدید کا میگنا کارٹا قرار دیتے ہیں۔ حالی نے مقدمہ میں اخلاقی اقدار پر بہت زور دیا ہے۔ خواجہ صاحب کی تنقیدات پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ بھی کسی جذباتی رو میں نہیں بہتے بل کہ اپنا ایک واضح نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود دوسروں کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ وہ صحت مند اختلاف ضرور کرتے ہیں لیکن آپ کو ان کے ہاں افراط و تفریط کی فضا نظر نہیں آئے گی۔

خواجہ محمد زکریا کی تحریریں اس امر کی غماز ہیں کہ ان کی تنقیدی رائے دوسروں کی تنقید پر استوار ہونے کے بجائے براہِ راست مطالعہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بنا بریں ان کی تنقید اوریجنل ہوتی ہے مثلاً عام طور پر یگانہ کو بڑا شاعر تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن ان کی رائے میں میر، غالب اور اقبال کے بعد یگانہ بڑے شعرا کی صف میں شمار ہوتا ہے۔ پھر آپ نے بعض ایسے اہم ادیبوں پر بھی قلم اُٹھایا ہے جن کے بارے میں معاصر تنقید گرم جوشی کا مظاہرہ کرتی نظر نہیں آتی۔ مثلاً ریاض احمد، شاد عارفی وغیرہ۔ اسی طرح آپ نے اس زمانے میں مجید امجد کی شاعرانہ عظمت کی بات کی جب بڑے بڑے نقاد مجید امجد کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ وقت نے آپ کی رائے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

میں استادِ گرامی کا سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر ان مضامین کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ میں اپنے عزیز دوست ڈاکٹر محمد عاصم ندیم کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان کی وساطت سے کتاب کی اشاعت کا اہتمام ہو رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

سید ریاض حسین زیدی کی نعت گوئی

سید ریاض حسین زیدی کی شخصیت میں خوش خلقی، عاجزی، وسیع القلبی اور محنت کے جو نمایاں اوصاف شامل ہیں انھی کی روشنی میں زیدی صاحب کی علمی و ادبی شخصیت کے خدوخال ترتیب پاتے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات اور مصروفیات میں انھی اوصاف کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں بالخصوص زیدی صاحب کی نعت گوئی کا تذکرہ مقصود ہے۔ انھوں نے نعت گوئی کو بصد افتخار و نیاز اپنائے رکھا اور رسالت محمدی پر کامل ایمان رکھتے ہوئے نعت میں اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقش ہائے رنگ رنگ کو اجاگر کیا۔

صنف نعت میں فنی اعتبار سے جو وسعتیں در آئی ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فی زمانہ نعت گو شاعر کو محض نعت کے موضوعات کا احاطہ کر لینے پر ادبی پہچان نصیب نہیں ہوتی بلکہ اسے اسلوب کی انفرادیت قائم کرنے کے لیے مضبوط کوشش اور گہرا تجربہ درکار ہے۔ زیدی صاحب کے نعتیہ مجموعوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات بآسانی اخذ کی جا سکتی ہے کہ وہ اس امتحان میں کس کس انداز سے کامیاب و کامران دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کسی بھی فنی خوبی کو ذہن میں رکھ کر ان کا کلام دیکھیے اس خوبی کی مثالیں بڑی سرعت سے جمع ہو جائیں گی۔ مثال کے طور پر ان کی نعتوں میں محاکات پر غور کیجیے، جس طرح غزل میں شاعر کسی امر کی تصویر کشی کر کے شعر کی زندگی کو بڑھا دیتا ہے اسی طرح نعت میں بھی زیدی صاحب نے فنکارانہ جوہر دکھائے ہیں:

خاک در حضور کا فیضان دیکھنا
اک نور تھا کہ سارے اندھیرے نگل گیا

فکر و عمل کی صورتیں گل پوش ہو گئیں
جو تھا لبادہ کفر و رذالت کا جل گیا
(ص:87)

جو دیکھا آپ نے مٹی کو لالہ زار ہوئی
جو بیج آپ نے بویا وہ لہلہانے لگا
(ص:27)

نگاہ کرم سے خطا کار بھی
سدھرتے، سنورتے، سنبھلتے گئے
ستم گر کے ہاتھوں میں ضعف آ گیا
وہ اٹھتے ہوئے ہاتھ ملتے گئے
بہار آفرینی اثر کر گئی
کہ سوکھے ہوئے پیڑ پھلتے گئے
(ص:38)

در خیرالوریٰ کی جالیاں ہیں
سر مژگاں ستارہ کھل رہا ہے
(ص:38)

صبیح رحمانی

اندھیرے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں
اجالا ہی اجالا ہو گیا ہے
(ص:184)

یہ مسلمہ ہے کہ غزل کی کلاسیکی روایت کا گہرا شعور رکھنے والا شاعر جب نعت میں طبع آزمائی کرتا ہے تو داخلیت، رمز و ایما، اور ایجاز و اختصار کی گیرائی اسے محکم اسلوب عطا کرتی ہے۔ الفاظ کے مختصر حلقے میں جہان معنی سمو دینے کا ہنر اس کے لیے اجنبی نہیں رہتا۔ زیدی صاحب نے مختصر بحروں کا استعمال بکثرت کیا ہے اور جہاں بھی کیا ہے سہل ممتنع کی یادگار مثالیں چھوڑی ہیں۔ ان کے ہاں عجیب رمزیت ہے جو کشف معنی میں حائل ہونے کے بجائے اس کی معاون و مددگار ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

نظر کس کی پڑی ہے دشتِ دل پر
ہر اک ذرہ ثریا ہو رہا ہے
تھا ہر سو پیاس کا صحرا اچانک
سمندر اک لبوں تک آ گیا ہے
(ص:38)

ظلمتوں کی رات باطل ہو گئی
صبحِ اقرا جب سے نازل ہو گئی
(ص:96)

پذیرائی ملی بے دست و پا کو
مقدر مسکرایا بینوا کا
(ص:23)

جہان خیر کی ہے عکس ریزی
جمال مصطفیٰ کیا آئنہ ہے
(ص:187)

آپ کی آنکھیں مسیحائی کریں
جی اٹھے ہیں مضمحل ، بیدم ، ملول
(ص:34)

یہ صدقہ ان کے فیض عام کا ہے
رگوں میں تیرتی پھرتی حرارت
لطافت کی پذیرائی ہوئی ہے
ہوا ہر سطح پر رد کثافت
(ص:182)

کمال اوج کی پہلی مسافت
مرے مولا حد افلاک دیکھیں
(ص:116)

نبی کی نسبت اعلیٰ ، دوامی
یہ سب رشتے ہیں فانی تیرے میرے
شجر مکے مدینے کے مثالی
جھلستی دھوپ میں سائے گھنیرے
فقط محکم عقیدہ کام آیا
اڑے ہیں دائیں اونچے پھریرے
(ص:139)

سید ریاض حسین زیدی کی نعت گوئی کسی وقتی احساس کا سطحی اظہار نہیں۔ بلکہ ان کی نعت کا فکری و موضوعی مطالعہ کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی فکر رسا آنحضور کی بعثت، تبلیغ، حیات و سیرت اور اسوۂ حسنہ کی بیکناری سے وسیع اکتساب کرتی ہے۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت و بشریت کے فیضان کو دو جہانوں میں جاری و ساری دیکھتے ہیں اور اسی سے اپنے ذاتی، تاریخی اور تہذیبی شعور کو صیقل کرتے

ہیں۔ان کے ایسے اشعار بھی لائق توجہ ہیں جہاں نہ صرف افکار منفرد ہیں بلکہ الفاظ کا چناؤ بھی شاعر کی ندرت پسندی کا اعلان کرتا ہے۔ان کے ہاں یہ سب عناصر مل کر منفرد شعری زمینوں کی ترتیب کا باعث ہوئے ہیں۔ مضامین متنوع ہوتے ہوئے بھی باہم پیوست ہیں، بیک وقت اظہار کی رنگا رنگ کرنیں قرطاس نعت پر سایہ فگن ہیں۔ ایک رنگ شاعر کے اپنے داخلی و روحانی ترفع کا ہے، ایک رنگ تاریخ عالم پر فیضان رسالت کے اثرات کا ہے، ایک رنگ اس فیض کی دوامی و ابدی حیثیت کا نقیب ہے:

طلعت از بام ہوا آپ سے ہر راز حیات
ایک اک قول و عمل آپ کا کشف الحجب
(ص:20)

ہے حرمت معانی و الفاظ واشگاف
مژدہ! کہ ہے کھلا ہوا روشن ترین باب
(ص:28)

خاک آسا تھا میں ہمدوش ثریا ہو گیا
مجھ کو سامان پریدن، بے پر و بالی ہوئی
(ص:50)

حضور آپ کے بدر و حنین نے مجھ کو
سکت جفاؤں سے ٹکرانے کی دلائی ہے
(ص:52)

وجدان پل میں رحمت کبریٰ سے جا ملا
تھی دیدنی شعور کی زور آزمائیاں
(ص:63)

بیجان ہوئی جب بھی رگ جان ہماری
ذکر شہ والا نے لہو تازہ اچھالا
(ص:172)

زیدی صاحب کو غار حرا کا ذکر خصوصاً مرغوب ہے۔ یہ ایک جانب تو ان کی ذات کے روحانی زاویوں کی عکاسی کرتا ہے اور دوسری طرف اس بات کا بھی غماز ہے کہ ذات رسول کریم سے گہرے شغف کی بنا پر وہ ابعاد رسالت پر پیہم غور و فکر کرتے ہیں تو ان کی وجدانی فکر کبھی نور ہدایت کی پہلی کرن کی طرف بار بار پلٹ کر دیکھتی ہے، کبھی ابد کے پار پھیلی تابشوں کی طرف بیتابانہ لپکتی ہے۔غار حرا کا یہ ذکر اکثر اشعار میں ہے:

ریاض دل کشادہ تر ہوا ہے
کھلا روزن یہاں غار حرا کا
(ص:23)

جہان معرفت ہے منکشف یوں
دل و جاں میں کھلا غار حرا ہے
(ص:93)

کھل گیا باب حرا ہے دل میں
نور رحمت کا رچا ہے دل میں
(ص:113)

مضامین معرفت کے آ رہے ہیں
مرے دل میں بسا غار حرا ہے

.....

سیدہ آمنہ ریاض اور ڈاکٹر نوید عاجز مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان انوار معانی کو سمیٹنے کی سعادت انھیں تفویض ہوئی ہے۔

☆☆☆☆☆

حُسن مصر

ڈاکٹر محسن مگھیانہ کو نہ جانے کیا سوجھی کہ نشتر زنی اور چیر پھاڑ کرتے کرتے ادب سے دل لگا بیٹھے موصوف ایک مشہور و معروف اور کامیاب سرجن ہیں - جھنگ میں ذاتی ہسپتال کے مالک ہیں- چاہیے تو یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے اس کل وقتی پیشے سے منسلک رہتے کچھ مریضوں کی دعائیں اور بعض کی بددعائیں سمیٹتے اور زندگی چین سے بسر کرتے مگر انھوں نے اپنے لیے مشکل راہ چنی اور ڈاکٹری کے ساتھ ساتھ ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ کبھی دل چاہا تو طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑ کر دکھی اور پریشان لوگوں میں مسکراہٹیں بانٹنے گے اور کبھی شاعری اور کالم نویسی کے ذریعے اظہار ذات اور اصلاح احوال کرنے لگے۔ تاہم کیونکر زیر نظر کتاب ''حسنِ مصر'' ایک سفرنامہ ہے اس لیے ان کی شاعری اور کالم نویسی سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ''حسنِ مصر'' پر بات کرتے ہیں۔

بہتر تبصرہ تو کوئی نقاد ہی کر سکتا ہے۔ عام قاری کی حیثیت سے محسن مگھیانہ کے سفرنامہ پر چند سطریں لکھتے ہوئے میں بہت خوشی محسوس کر رہی ہوں۔

سفرنامہ کبھی میری دلچسپی کا موضوع نہیں رہا کیونکہ ذرائع ابلاغ نے اتنی ترقی کر لی ہے اب گھر بیٹھے دنیا کی سیاحت کا لطف اٹھا سکتے ہیں لیکن ''حسنِ مصر'' محض ایک سفرنامہ نہیں ہے یہ مصر کے ماضی اور حال کا منظرنامہ ہے۔ محسن مگھیانہ نے پوری سچائی سے تاریخ اور ادب کے دریچوں میں جھانک کر خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔

ہمارے یہاں مزاح نگاروں کی ایک کہکشاں جگمگا رہی ہے۔ محسن مگھیانہ کا کمال یہ ہے کہ اتنے سارے درخشاں ستاروں کے ہوتے ہوئے انھوں نے اپنی مزاح نگاری کا لوہا منوایا ہے۔ ان کا طرز تحریر، انداز اور لب و لہجہ کسی کا چربہ نہیں بل کہ خالصتاً اپنا ہے۔ ان کی تحریر میں سادگی، سلاست اور بے ساختہ پن ہے۔ سفرنامہ پڑھتے ہوئے کہیں بھی بوریت اور بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔ جگہ جگہ مزاح کی چاشنی طبیعت میں شگفتگی پیدا کرتی ہے واقعات

سیما پیروز

بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ مطالعہ کرتے ہوئے بے ساختہ لبوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے ان کی تحریر میں خوبصورت لفظوں اور معنی خیز جملوں کی بہتات ہے۔ وہ گرد و پیش کی منظر نگاری کرنے میں کمال کی دسترس رکھتے ہیں پورے سفرنامے میں قاری اپنے آپ کو ان کے ساتھ ساتھ محسوس کرتا ہے۔ ہر منظر نامہ پوری جزئیات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں ایک تخلیق کار کی پوری دیانت داری کے ساتھ لکھتے ہیں۔

اس کتاب میں صرف مزاح ہی نہیں بلکہ قدیم مصر کی تاریخ، تہذیب و تمدن اسلامی تاریخ اور موجودہ حالات و واقعات کا بیان بھی ہے۔ اس ضمن میں نیل کے نام حضرت عمر کا خط، فرعون کے گھر حضرت موسیٰ کی پرورش، فرعون کا غرق ہونا، اہرام مصر اور قاہرہ کا تاریخی التحریر اسکوائر کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ واقعات کی کڑی سے کڑی ملاتے چلے جاتے ہیں اور بات سے بات نکالتے ہیں قاری یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

محسن مگھیانہ کا سفرنامہ دوسرے سفرناموں سے اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس میں معلومات اور واقعات کے علاوہ مزاح کی چاشنی ہے۔ ان کی تحریر میں بے ساختہ پن ہے بظاہر وہ مزاحیہ بات کرتے ہیں لیکن غور کریں تو بہت گہری ہوتی ہے۔ جیسے دوران فلائٹ ایئر ہوسٹس سے چائے اور کپ کے مکالمے میں کیا زبردست طنز اور سچائی ہے۔ ایئر ہوسٹس کہتی ہے ''ہم ڈیل کرتے ہیں۔ آپ مجھے کپ دیں میں آپ کو چائے دیتی ہوں۔''

محسن مگھیانہ لکھتے ہیں ''سو ڈیل ہوگئی۔ ہم کوئی بہت بڑے سیاست دان تو تھے نہیں کہ کوئی بڑی سیاسی ڈیل کرتے بس چھوٹی سی چائے کی ڈیل تھی سو کر لی۔''

جا بجا مزیدار اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جیسے ہرجائی کرسی، اسی کی ہوتی ہے جو اس پر براجمان ہو۔ اس جملے میں کیا گہرائی کاٹ ہے۔ ان کی تخلیقی آنکھ سے کوئی منظر اوجھل نہیں رہا اور نہ یہ ان کے قلم نے اسے تخلیق کرنے میں بخل سے کام لیا۔ انسانی شکلوں کی مماثلت کا بیاں ہی لے لیں اس میں کیا اعلیٰ مزاح پیدا کیا ہے۔ ہر خاتون انھیں کسی اور خاتون سے ملتی جلتی لگی کوئی ایئر ہوسٹس انھیں جولیا رابرٹ کوئی بابرہ شریف اور کسی کو قطرینہ سے جا ملایا۔ ان کے سفرنامہ کی سب سے بڑی خوبی ہی ہے کہ جب تک آپ پڑھتے رہتے ہیں اس کے سحر میں گرفتار ہو کر غم دوراں اور غم جاناں سے مکمل طور پر دور رہتے ہیں۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ آپ اسی طرح مزاح تخلیق کرتے رہیں لوگوں کو ہنساتے رہیں مسکراہٹیں بانٹتے رہیں کہ اس قحط الرجال کے دور میں رُلانے والے تو بہت ہی ہیں پر روتوں کو ہنسانے والے بہت کم ہیں۔

☆☆☆☆☆

''پیار کی پہلی بارش'' میں بھیگتا، [افتخار شوکت]

میرے استادِ ذی وقار محترم بشیر احمد بشیر کا شعر ہے:

بے خیالی میں اٹھاتے ہی کتاب
کوئی کھلتا ہوا در یاد آیا

ابھی چند دن پہلے کی بات ہے، بہت ہی پیارے، 'افتخار شوکت' کا شعری مجموعہ 'پیار کی پہلی بارش' ملا کتاب پر نظر پڑتے ہی میری کیفیت استادِ محترم جیسی تھی کہ کتاب اٹھاتے ہی یادوں کے دریچے وا ہوتے چلے گئے۔ کتاب کا عنوان پڑھتے ہی پیار کی بارش میں تن من بھیگتا محسوس ہونے لگا۔ بارش میں بھیگنا نہ صرف مجھے اچھا لگتا ہے بلکہ میری زندگی کی بہت سی انتہائی خوشگوار یادیں بارش میں بھیگی ہوئی ہیں۔ ناصر کاظمی ''پہلی بارش'' بھی مجھے اسی لیے پسند ہے کہ اس کے بہت سے شعروں میں مجھے اپنا کھویا ہوا ماضی یاد آنے لگتا ہے۔ کتاب کی پشت پر ایک خوبرو نوجوان کی تصویر دیکھ کر دل میں جوانی نے انگڑائی لی اور ایک عجیب سی توانائی جسم میں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔ ''افتخار'' سے میرا غائبانہ تعارف زیادہ نہیں تو ربع صدی کے لگ بھگ پرانا ضرور ہے، لیکن ان کے والدگرامی پروفیسر شوکت علی چودھری سے تعارف اس سے بھی کہیں پہلے کا ہے، وہ میرے کالج (گورنمنٹ کالج ساہیوال) اساتذہ کے کولیگ رہے، اس ناطے میرا ان سے، عقیدت اور احترام کا وہی تعلق رہا جو اساتذہ کے ساتھ کسی طالب علم کا ہوتا ہے۔ ان سے ایک رشتہ محلے دار کا بھی بنتا

رزاق شاہد

ہے کہ وہ فرید ٹاؤن میں 'اونی' (Y) بلاک میں رہائش پذیر تھے اور میرا آبائی گھر ایکس (X) بلاک میں تھا، افتخار گو میرا بہت جونیئر بنتا ہے لیکن کالج فیلو ہونے اور استاد زادہ ہونے کے ناطے مجھے بہت ہی عزیز رہا۔ گو اس سے ملاقات ابھی تک ایک سہانا خواب لگتی ہے۔

آج سے لگ بھگ 24/22 سال پہلے جب میں اپنے 'پی ایچ ڈی' کے مقالہ پر کام کر رہا تھا تو برادر عزیز علی رضا خان کی وساطت سے ساہیوال کے جن نوجوان شعرا کا تعارف حاصل ہوا، ان میں ایک نام 'افتخار شوکت' کا بھی تھا، جو شاید ان دنوں ساہیوال گورنمنٹ کالج کے طالب علم تھے۔

کتاب کے عنوان کو لے کر میرا خیال تھا کہ اس میں ناصر کاظمی کی ''پہلی بارش'' کی طرح جگہ جگہ 'بارش' استعارے یا علامت کے طور پر 'برس' رہی ہوگی۔ اسی لیے میں اس مجموعے میں بارش ڈھونڈتا رہا۔ عجیب بات ہے کہ 46 غزلیات میں صرف دو جگہ جمع کے صیغے میں لفظ ''بارشیں'' استعمال ہوا ہے:

بارشوں میں اور ہوتا ہے جنوں
چاندنی راتوں میں وحشت اور ہے

ان کو میرے ساتھ ہی جلنا پڑا
بارشوں کو میں بہت مہنگا پڑا

.....

البتہ بارش یا پانی کے متعلقات جیسے، بوندیں، اشک، سمندر، ساحل، کنارہ، کشتی، لہریں، جھیل، پیاس ضرور استعمال ہوئے ہیں۔

کتاب کا آغاز حسبِ روایت حمد، نعت اور سلام سے ہوا ہے۔ ہمارے کلاسیک ادب میں استاد شعرا نے بھی (تبرکاً) حمد و نعت شامل کی ہیں۔ پنجاب کلاسیک ادب میں یہ روایت اور آگے تک چلی گئی ہے کہ اس میں منقبت، معراج نامے اور مولود نامے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے یہ ہمارے ایمان کا جزو ہے کہ حمد و نعت اور سلام و منقبت برکت کے لیے شامل کی جائیں۔ جیسے ہم کسی بھی کام کی ابتدا ''بسم اللہ'' سے کرتے ہیں۔ گویا اللہ کا نام برکت کے حصول کی ضمانت بنتا ہے۔ حمد کا پہلا شعر ہی بڑا خوبصورت ہے:

ذات وہم و گماں سے باہر ہے
حمد اس کے بیاں سے باہر ہے

نعت کا بھی پہلا ہی شعر دل میں اترتا محسوس محسوس ہوتا ہے، کہتے ہیں:

ہستی کا کچھ وجود نہ تھا، آپؐ کے بغیر
خوشبو سے بے خبر تھی ہوا، آپؐ کے بغیر

.....

حمد اور نعت کے کسی بھی شعر کو ہم اچھا بُرا کی کسوٹی پر ہیں پرکھ سکتے کیوں کہ یہ تو محض عقیدت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ

شعر حمد کا ہو یا نعت کا اس میں انتہائی مبالغہ بھی کمتر پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ ہر دو ہستیوں (اللہ اور اس کے نبیؐ) کی صفت و ثنا کسی بھی حدود و قیود سے ماورا ہیں۔ ہم ان شعروں سے شاعر کی ان ہستیوں سے عقیدت اور کسی حد تک عشق کو پرکھ سکتے ہیں۔ ان سے محبت ہر مسلمان کے عقیدہ کی بنیاد ہے۔

مجھے ان کے کلام میں 'غمِ جاناں اور غمِ دوراں' کا خوبصورت اور حسین امتزاج بھی نظر آیا ہے، آپ اسے چاہیں تو 'روایت اور جدیدیت کا سنگم' کہہ سکتے ہیں۔ ویسے بڑی ہی معذرت کے ساتھ میرے نزدیک غزل کی جدید اور قدیم کی تقسیم سمجھ سے باہر ہے۔ شاعر جس عہد میں جی رہا ہوتا ہے وہ اس کا دورِ جدید ہوتا ہے، جب یہ گزر جاتا ہے تو خود بخود قدیم ہو جاتا ہے۔ ہر شاعر اپنے عہد میں ہی جیتا ہے، اسی عہد کے عصر تقاضوں کو بیان کرتا ہے۔ آج کے عہد کا شاعر میر یا غالب کے دور کے عصری تقاضوں کو تو بیان کرنے سے رہا، ہاں البتہ 'غزل' کی اپنی ایک روایت ہے۔ اس روایت سے کٹ کر غزل کہی ہی نہیں جا سکتی البتہ اظہار کا پیرایہ ہر شاعر اور ہر عہد کا اپنا ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے اس اعتبار سے بھی مجھے۔ افتخار شوکت کی شاعری اچھی لگی کہ اس نے، جدیدیت کے چکر میں، غزل کی روایت کو پسِ پشت نہیں ڈالا، بلکہ ساتھ ساتھ لے کر چلے ہیں:

وہ سفر میرے لیے ہے معتبر
جس سفر میں بھی تمھارا ساتھ ہے

میں کسی کی آنکھ سے سرسبز تھا
میں کسی کی بات سے پیلا پڑا

جسم پر میرے دراڑیں پڑ گئیں
غصہ مجھ کو روز ہی پینا پڑا

.....

کبھی دکھ ہے، کبھی خوشی ہے میاں
بس یہی حسنِ زندگی ہے میاں
آپ بیتی ہے تھوڑی جگ بیتی ہے
یہ جو شوکت کی شاعری ہے میاں

.....

کتاب کے کسی ورق پر غالباً خالد شریف نے ان کی شعری خوبی ''سہل ممتنع'' کی طرف ضمناً اشارہ کرتے ہے لکھا ہے کہ ''وہ سادہ اور رواں بحروں میں خوب شعر نکالتے ہیں۔'' میں نے محسوس کیا ہے کہ افتخار کی شاعری میں یہ عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ بلکہ اگر مجھے کہنے دیا جائے کہ اس کے مجموعہ میں اکثر اشعار اور اکثر غزلیں ''سہلِ ممتنع'' کی خوبصورت مثالیں ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ سہل ممتنع کا متضاد 'تصنع اور بناوٹ' ہے۔ پورے مجموعے میں مجھے ایک شعر بھی ایسا نہیں ملا جسے تصنع کے زمرے میں شمار

کیا جا سکے۔ میرا خیال ہے کہ شعر میں تصنع تب آتا ہے جب شعر "بنانے" کی کوشش کی جائے۔ میرے نزدیک شعر کہا جاتا ہے۔ بنایا نہیں جاتا۔ اس حوالے سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ افتخار نے شعر بنائے نہیں کہے ہیں:

لفظ کو پھول بنانے میں بہت دیر لگی
حالِ دل اس کو سنانے میں بہت دیر لگی
میں اکیلا تھا مجھے کون تسلی دیتا
اشک آنکھوں کے سکھانے میں بہت دیر لگی

....

کوئی تہمت نہ داغِ رسوائی
یہ محبت بھی کیا محبت ہے

....

یاد کرتا نہ بھول پاتا ہوں
اک مسلسل عذاب سا کچھ ہے

....

ہو نہ ہو اس کا نقشِ پا ہو گا
یہ جو کچھ روشنی سی لگتی ہے

....

انسان کی دنیاوی زندگی تلخیوں سے عبارت ہے، اس میں محبت، صحرا میں اچانک کسی نخلستان کے نمودار ہونے سے ملنے والے خوشی سے کم نہیں، محبت کو کوئی نام دے لیں، اسے پیار کہہ لیں یا عشق کہیں، یہ زندگی کی تکمیل کا دوسرا نام ہے۔ انسان تو انسان جانوروں سے بھی پیار کریں تو وہ بھی ویسا ہی اظہار آپ سے کریں گے۔ انسان تو پھر اشرف المخلوق ہے، جس کو گھٹی ہی محبت کی چاشنی کی ملتی ہے۔ خالد شریف نے انھیں "محبت کا شاعر" بالکل درست لکھا ہے۔ پیار بھی محبت ہی کا متبادل ہے، البتہ عشق محبت سے اگلی منزل کی طرف قدم نہیں بڑھایا یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں پیار اور محبت کا لفظ تواتر سے آیا ہے بلکہ اس نے دو غزلوں کی ردیف ہی 'محبت ہے' رکھی ہے۔ اس کے برعکس عشق کا لفظ غالباً پانچ چھ بار ہی آیا ہے، یہ گواہی ہے اس بات کی کہ اس ابھی عشق کی منزل تک پہنچنے میں دیر ہے۔ ان کا اپنا ایک شعر گواہی دیتا ہے کہ:

عین ممکن ہے عشق ہو جائے
ورنہ فی الحال دل لگی ہے میاں

....

گویا یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ اسے ابھی عشق نہیں ہوا۔ ہاں البتہ ان کی شاعری لفظ محبت اور پیار ہی سے نہیں بلکہ محبت کے جذبات سے لبریز اور بھرپور ہے۔

بچپن گزارا میں نے کڑی دھوپ میں بہت
چہرے پہ اب تو پیار کا آنچل کرے کوئی

....

ساتھ گر دے نہیں سکتے تو تسلی مت دو
میری مشکل کو مرے دوست بڑھایا نہ کرو

....

کہ خاکسار میں ایسی تو کوئی بات نہیں
توجہ کی ہے تو یہ آپ کی محبت ہے

محبتیں مجھے ملتی ہیں اس لیے شاید
کہ افتخار میری شاعری محبت ہے

.....

کوئی لکھت ، معاہدہ نہ رسید
سب ہی کچھ پیار میں زبانی ہے

.....

ان کو کیسے گنواؤں ہاتھوں سے
وہ جو مشکل سے ہاتھ آتے ہیں

.....

افتخار شفیع نے اپنے مضمون میں ساہیوال کے شعرا اور ساہیوال کی ادبی روایت کی بات کی ہے، جہاں بڑے قد آور شعرا کا ذکر آتا ہے۔ اس روایت کے کچھ بڑے نام جیسے مجید امجد، منیر نیازی، ظفر اقبال اور اکرم خان قمر بھی ہیں۔ ظفر اقبال کی شہرت ساہیوال کی نسبت سے رہی، قمر صاحب غزل اور ساہیوال کی شعری روایت کی ایک جاندار اور توانا آواز، تھی بلکہ ان کے پیش رو مولانا عطا اللہ جنون اور مولانا عظامی جیسے قد آور شعرا ساہیوال کی ادبی روایت کے 'سرخیل' مشہور تھے۔

اس عہد میں لاہور کے بعد ساہیوال دبستان کے طور پر معروف تھا۔ اس قدر عظیم شعری روایت کے حامل شہر کی نسبت یا اس کی ادبی محفلوں سے استفادہ میرے یا افتخار کے لیے یہ نہیں، کسی کے لیے بھی فخر سے کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر سے آج بھی تازہ ہوا کے جھونکے فرحت کا احساس دلاتے ہیں، جیسے افتخار کی ''پیار کی پہلی بارش'' تو ساتھ میں خوشگوار خنکی بھی لیے ہوئے ہے۔ خاص طور پر عطاالحق قاسمی نے ان کی شاعری میں جس انفرادیت کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی بہت سی جھلکیاں ان کی شاعری میں جا بجا دیکھی جا سکتی ہیں۔ صرف ایک شعر پر اکتفا کروں گا کہ:

میں کسی کے دھیان میں بیٹھا رہا
جب انگارا ہاتھ پر رکھا گیا

.....

یہ محویت اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آتی، اس کے لیے بڑا ہونا پڑتا ہیں، تب جا کر یہ گوہر نایاب ہاتھ آتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا شاعر محبت کی ریاضت میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اب غالباً وہ عشق کی منزل کی طرف سفر کے قابل ہو چکا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ وہ محبت کے امتحان کی طرح عشق میں بھی کامیاب ہوتا کہ ہم اس سے اگلے شعری مجموعے، بلکہ کئی شعری مجموعوں کی امید لگا سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ میرے یقین کی وجہ ان کے دو اشعار ہیں جو آپ کی نظر کر رہا ہوں۔

دل کو کیا سمجھاتے ہو
آنکھوں کو تلقین کرو

وہ اترے گی سبھی سے
ہاتھوں کو قالین کرو

☆☆☆☆☆

نثار ترابی_ محبت اور خوش خلقی سے گندھی ہوئی شخصیت

نصرت نسیم

کچھ لوگوں کی شخصیت منکسر المزاجی، محبت اور خوش خلقی سے ایسی گندھی ہوئی ہوتی ہے کہ پہلی ملاقات ہی میں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مدتوں کی شناسائی ہے۔

جی میں بات کر رہی ہوں نئی نسل کے نمائندہ اور ممتاز شاعر، ادیب، استاد، محقق نثار ترابی صاحب کی جو نثار بھی ہیں اور ترابی بھی مٹی سے جڑے نثار ترابی میں فروتنی اور منکسر المزاجی ہے۔ خوش خلقی ہے۔

(نوشہرہ) ڈگری کالج برائے خواتین کالج میں ہماری دوست اور معروف سفرنامہ نگار اور افسانہ نگار محترمہ مشرف مبشر کی کتاب کی تقریب پذیرائی تھی۔

نثار ترابی مذکورہ تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔۔ گو وہ دیر سے آئے مگر آتے ہی اپنی شیرینیٔ گفتار سے محفل پر چھا گئے۔ ریڈیو پاکستان کی ڈائریکٹر عفت جبار نے ان سے میرا تعارف کروایا۔

ظہرانے پر میں نے انہیں اپنی کتاب ''حاشیہ خیال'' ترابی صاحب کو پیش کی۔ چیئرمین شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی ڈاکٹر سلیمان علی بھی قریب کھڑے تھے انہوں نے کتاب کی تعریف کی

اور اسلوب کو سراہا۔ ترابی صاحب نے بڑی گرم جوشی سے میری کتابیں لیں اور وعدہ کیا کہ جلد ہی پڑھ کر تبصرہ کریں گے۔ مجھے بہت حیرت اور خوشی ہوئی۔ جب دوسرے ہی دن ان کا فون آ گیا۔ انھوں نے میری ''خود نوشت'' ''بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں'' کی دل کھول کر تعریف کی اور افسوس کا اظہار کیا کہ کسی نے اب تک آپ کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ ہم ہنس دیئے ہم چپ رہے۔

دل میں سوچا ابتدائی ابواب پڑھے ہوں گے مگر جب انھوں نے پوری کتاب سے چیدہ چیدہ پسندیدہ اقتباسات کا ذکر کیا، تو مزید حیرانی ہوئی۔ (اس لئے کہ اکثر بڑے ادیبوں شاعروں کو کتابیں دیں مگر انھوں نے تبصرہ تو درکنار رسید دینا بھی گوارا نہ کیا۔) بڑے لکھاری ہونا الگ بات ہے اور بڑا انسان ہونا الگ۔

تبصرے کا وعدہ بھی انہوں نے یوں پورا کیا کہ خود بیمار ہو گئے تو اپنے دوست معروف کالم نگار اور شاعر نیّر سرحدی صاحب کو یہ لکھ کر کتاب بھجوادی کہ ''اس پر تبصرہ کرنا ہے''۔ انہوں نے بھی بہت جلد پڑھ کر مفصل اور دلآویز تبصرہ لکھ بھیجا اپنے اخبار رونامہ ''ایکسپریس'' میں بھی شائع کروایا۔

یہ سب لکھنے کا مقصد نثار ترابی صاحب کی بالاقد علمی و ادبی شخصیت، وعدے کی پابندی، احترام آدمیت، اور بے غرضی کو ظاہر کرنا ہے۔ میں کوئی معروف ادیبہ نہیں وہ ایک بڑے شاعر، ادیب، محقق، استاد ہیں۔ کسی کی حوصلہ افزائی کرنا، سراہنا یہ بڑے ظرف کی بات ہے۔ بڑے ظرف والے اور بڑے لوگ ہی ایسی کشادہ دلی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا واقعہ سے ان کی شخصیت کی کئی پرتیں اور کئی خوبیاں سامنے آئیں تو بے ساختہ غلام محمد قاصر صاحب کا یہ شعر یاد آ گیا کہ:

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

.....

پھر چند دن بعد ان کی طرف سے کتابوں کا پارسل موصول ہوا۔ ان کی کتاب ''تحقیقی تخلیقی زاویے'' موصول ہوئی تو ان کے تخلیقی و تحقیقی زاویوں سے ان کے مزید جوہر کھلے۔ وہ استاد، ادیب، شاعر محقق لوح و قلم سے جڑے ادیب ہیں۔ ادب شناسوں میں شمار، تحقیق اور جستجو جس کا شعار، گن بے شمار، دوستی نبھانے والے، حوصلہ افزائی اور پذیرائی کرنے والے خندہ جبیں، شیریں سخن آسانیاں اور خیر بانٹنے والے ایسے عالم جن کے ہاں قدیم و جدید کا عمدہ امتزاج، زبان

وبیان صاف شستہ اور رواں دواں عمدہ اسلوب بیان کہ تحقیق کو تنجلک ہونے نہ دے بل کہ تحقیق تخلیقی انداز لیے ہوئے اور محبت میں چاشنی گھلے ہوئے۔ سب تنقید نہیں تقاریظ ہیں۔ محبت، حوصلہ افزائی اور قدر دانی کے احساس سے مملو ہیں۔ ان تمام تقاریظ میں قاری الجھنے کے بجائے تخلیقیت، بلند خیالی، زبان وبیان کا رچاؤ اور دلربا اسلوب کا لطف کشید کرتا ہے۔

اس کتاب میں 27 مقالے قدیم وجدید کا دلآویز مرقع ہیں۔ ایک طرف انہوں نے اردو ادب کے نامور ادبا اور محققین کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے تو دوسری طرف نئے لکھنے والوں کو بھی اتنی ہی عمدگی سے سراہا۔ ان کے تحریر کردہ دیباچے بعنوان ''حرفِ محبت'' میں محبت کی چاشنی ہے۔

یہ 27 مقالے ان کی ہمہ گیری، ہر صنفِ ادب پر عبور اور گہری بصیرت کے غماز ہیں۔ ٹینی سن کا کہنا ہے کہ ایک اچھے نقاد کی مثال ایسے شخص کی ہے کہ جو گھنے جنگل میں گزرتے ہوئے جھاڑ جھنکار ہٹا کر آنے والوں کے لئے راستہ صاف کرتا ہے۔'' میرے خیال میں بطور محقق انھوں نے راستے بھی دکھائے ہیں اور ادبِ عالیہ کی ایسی تفہیم کی ہے کہ بے اختیار کتاب پڑھنے کو دل چاہے۔ بہت خوب صورت عنوانات جو نغمگی لئے ہوئے ہیں مثلاً فتح محمد ملک، ادب میں فتح مندی کا امتیازی نشان تخلیق کی منور راہوں کا راہی، ''گ'' سے گڑیا ''ج'' سے جاپانی، ہوا کا سمندر اور تخلیق کا ساحل اظہر غوری کی غیر مشروط محبت اور ''کنارِ خواب کا تشنہ مسافر'' وغیرہ

محترم جبار مرزا صاحب کی منفرد داستان محبت ''پہل اس نے کی تھی'' کو بہت پریم اور چاؤ سے بیان کیا۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین کے مقالے ''مظفر علی سید ایک مطالعہ'' اور ڈاکٹر سلیمان کے سفرنامے کی جمال آفرینی اور دل ربائی قابل ستائش ہے۔ عنوان ہی دامنِ دل کو کھینچ لیتا ہے۔ اے نشہ، ظہور تخلیقی جمال سے مزین ایک مختصر سفر نامہ۔ ہر صنف ادب پر لکھنا گہرے مطالعے کا متقاضی ہے اور یہ مضامین ان کی علمی بصیرت، ژرف نگاہی، اور مطالعاتی ہمہ گیری کا بین ثبوت ہیں۔

نامور نقاد پروفیسر فتح محمد ملک نے اُن کی کتاب ''اردو غزل کے عصری رویّے'' کا فلیپ تحریر کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے کہ ''(نثار ترابی) بیک وقت ایک دل نواز شاعر، اچھے محقق اور گہری تنقیدی نظر رکھنے والے نقاد ہیں۔'' میری دلی دعا ہے کہ سلامت رہیں۔ قلم بدست رہیں۔ آمین

☆☆☆☆☆

ظلم سہہ کر جو حق سامنے آتا ہے وہ تا قیامت موثر رہتا ہے کربلا میں شہادت حسینؑ اس کی شہادت ہے

فلسطین کا امن پوری انسانیت کا امتحان ہے

دنیا میں سینکڑوں مذاہب کے انسان آباد ہیں اگر سارے مذہبوں کے عقیدے کا خلاصہ بیان کیا جائے تو انسانیت اور بھلائی ہی نکلے گا جو انسانیت کا دشمن ہوگا وہ مذہب کا بھی گنہگار ہوگا کیونکہ کوئی مذہب انسانوں پر ظلم کرنے کی اجازت نہیں دیتا احترام انسانیت ہی ہر انسان کو اُس کے مذہب کا محبوب بناتا ہے یہ تحریر انسانیت کے نام فلسطین میں انسانیت بچاؤ کا پیغام ہے۔

ظالم شاید بھول گئے ہیں مظلوم کا متاثر ہونا اس کی افضلیت بڑھا دیتا ہے ظلم سہہ کر جو حق سامنے آتا ہے وہ تا قیامت موثر رہتا ہے کربلا میں شہادت حسینؑ اس کی شہادت ہے ۔ آیئے ذرا انسانیت کا چشمہ لگا کر فلسطین کے انسانوں پر گزرنے والے شب و روز کا دل کے دماغ سے مطالعہ کیجئے۔ ہر روز اسرائیل غزہ میں 2 4 بم برساتا ہے جس کی وجہ سے 12 عمارتیں بتاہ برباد ہو جاتی ہیں 15 افراد شہید ہوتے ہیں جن میں 6 بچے ہوتے ہیں اور 35 سے زائد افراد زخمی ہوتے ہیں 7 اکتوبر سے لے کر 28 اپریل تک پورے غزہ کے اندر 60 فیصد تک ٹوٹل عمارتیں تباہ ہو چکی ہیں 80 فیصد کاروباری جگہیں دکانیں مارکیٹ پلازہ و دیگر زریعہ آمدن کے مقامات تباہ ہو چکے ہیں 267 مسجدیں تباہ ہو چکی ہیں غزہ کی حالت کا اندازہ لگایئے کہ خدا کے ماننے والوں کے گھروں کے ساتھ ساتھ خدا کے گھر بھی تباہ کر کے دور حاضر کی فرعونی طاقتوں نے اپنے غرور تکبر ظلم و طاقت سے نا صرف مسلمانوں کی بے حسی کو للکارا ہے بلکہ خدا سے جنگ کا آغاز کیا ہوا ہے سیاست کے لیے مذہب کو استعمال کرنے والوں کی جہاں بابری مسجد پر چیخیں سنائی دی تھیں وہاں غزہ کی مسجدوں کی تباہی پر

ظفر اقبال ظفر

خاموشی بھی دکھائی دے رہی ہے - 25 ہسپتالوں میں سے 11 ہسپتال تباہ ہو چکے ہیں- زیرزمین پانی کا نظام 83 فیصد تباہ ہو چکا ہے- 100 میں سے 73 سکولوں کی بلڈنگیں تباہ ہو چکی ہیں- 133 ایسے بچے شہادت پا چکے ہیں جنھوں نے زمین پر آنے کے بعد ایک دن بھی پورا نہیں دیکھا ماؤں نے جنم دیئے بچوں کو ابھی جی بھر کر دیکھا بھی نہ تھا کہ بم کی تباہی نے انسانیت کے نام و نشان مٹا دیئے - 482 ایسے بچے شہید ہوئے جن کی عمر ایک سال سے تین سال تک تھی- 347 چار سے پانچ سال کی عمر کے وہ بچے شہید ہوئے جنہوں نے ابھی سکول جانا شروع ہی کیا تھا- 1042 وہ بچے شہید ہوئے جو چھ سے بارہ سال کی عمر کے تھے- 664 تیرہ سال سے سترہ سال کی عمر کے بچے شہید ہوئے- پچیس سال سے کم عمر شہید بچوں کی تعداد 966 ہے اور 26 سال سے 55 سال کی عمر کی شہادتوں کی تعداد 2506 ہے- ہر دس منٹ کے بعد ایک فلسطینی بچہ شہید ہو رہا ہے جو ساٹھ فیصد عمارتیں تباہ ہوئی ہیں اس کے ملبے تلے دبے ہر عمر کے گمشدہ انسانوں کی تعداد تصور سے زیادہ ہے - فلسطینی انسانوں کی ایک تعداد ساؤتھ کی جانب روانہ ہوئی جو مصر کا بارڈر کہلاتی ہے سترہ کلو میٹر کی حدود رفا بارڈر پر کیمپ لگائے جیسے فلسطینی آبادی سے باہر خطرات سے پاک ٹھکانہ تصور کر کے بیٹھے تھے کہ انہیں خبر ہوئی کہ اسرائیل ان کی عمارتوں کے ملبے کو اکٹھا کر کے سمندر کی جانب لے جا رہا ہے جہاں وہ ایک بندرگاہ بنانا چاہتا ہے غزہ کی زندہ بچی عوام اُس ملبے سے اپنے پیاروں کی لاشیں تلاش کرنے پہنچے تو ان پر بم برسا کر شہید کر دیا گیا مردہ جسموں کی تلاش میں زندہ جسم بھی مردہ ہو گے - رشتوں اور گھروں کے کھو جانے والے افراد کے لیے کوئی کھانا لاتا تو وہاں جورش بنتا اُس پہ بم برسائے جاتے ہیں- مسلمان لوگوں کے لیے انتہائی شرم و بے حسی کا مقام یہ ہے کہ اس وقت پورے امریکہ کے اندر اسرائیل کے خلاف اور فلسطین کے حق میں یونیورسٹیوں میں ہنگامے و احتجاج ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے 2200 امریکی شہری گرفتار ہو چکے ہیں جن میں 70 ربڑ بلٹ کے زخمی ہیں انہوں نے نیویارک کے ہال پہ قبضہ کیا اور اس کا نام اُس چھ سالہ بچی ہند کے نام پہ رکھا جس کا پورا خاندان شہید ہو گیا تھا یہاں سوال یہ بنتا ہے کہ پاکستان میں 220 یونیورسٹیاں ہیں دس لاکھ مدرسوں کے طالب علم ہیں کتنے فلسطینی مسلمانوں کے لیے باہر نکلے ہیں؟ کتنے پاکستانیوں نے فلسطین کے درد کو اپنے سینے میں محسوس کر کے اسرائیلی ظلم روکنے کے لیے فلسطینی مسلمانوں کی مدد کا جذبہ دیکھا یا وہ مسلمان جن کا لڑنے کے بجائے صرف اکٹھا ہو جانا

ہی جنگ بندی کروا سکتا ہے - اگر آپ صرف دس اسلامی ممالک کی فوجی تعداد اور بجٹ پر نظر دوڑائیں تو علم ہوگا کہ بنگلہ دیش کی فوج 1 لاکھ 60 ہزار جس کا بجٹ 3.6 بلن ڈالر - سریا کی فوج 1 لاکھ 54 ہزار 1.87 بلین ڈالر بجٹ- ملائشیا کی فوج 1 لاکھ 10 ہزار 4.10 ارب ڈالر بجٹ - الجیریا کی فوج پانچ لاکھ بیس ہزار 10.6 بلین ڈالر بجٹ - سعودی عرب کی فوج 2 لاکھ 31 ہزار 70 ارب ڈالر بجٹ - پاکستان کی فوج 6 لاکھ 37 ہزار اور 2017 میں اس کا بجٹ 7 ارب ڈالر تھا- انڈونیشیا کی فوج 9 لاکھ 75 ہزار اور بجٹ 6 بلین ڈالر- ایران کی فوج 5 لاکھ 34 ہزار بجٹ 14 بلین ڈالر - مصر کی فوج 4 لاکھ 38 ہزار بجٹ 2.7 بلین ڈالر ہے ان چند اسلامی ممالک کی فوج کا ٹوٹل کیا جائے تو 57 لاکھ بنتی ہے دنیا کا کوئی جہاز میزائل آب دوز جنگی سامان ایسا نہیں جو امریکہ و یورپ میں بنتا ہو اور سعودی عرب یو-اے -ای - خریدتے نہ ہوں- دور حاضر کے مسلمانوں تم لڑاس لیے نہیں رہے کہ ابھی تک کوئی تمہیں جرت غیرت بہادری خودداری بیچنے ہی نہیں آیا؟ دوسری طرف جس نے فلسطینی انسانوں پر قیامت بھرپا کی ہوئی ہے اُس اسرائیل کی فوج کا بجٹ صرف 18.5 بلین ڈالر ہے - پوری دنیا میں ایک یہودی ایک ہندو پانچ عیسائی اور ایک مسلم ملک ایٹمی قوت ہیں 57- اسلامی ممالک میں اکلوتا ایٹمی ملک پاکستان ہے غزہ کے رہنما اسماعیل ہانیہ نے کہا تھا کہ اگر پاکستان صرف دھمکی دے دے تو جنگ بند ہوسکتی ہے- الجزیرہ ٹی وی کی کوریج کو دس منٹ تک دیکھ لیں تو انسانیت و مسلمانیت کا دل رکھنے والوں کے سینے پھٹنے لگتے ہیں دنیاوی طور پر سپر پاور کہلانے والی طاقتیں انسانی حقوق کی پاسداری میں ناکام ہوچکی ہیں اس دنیا کو امن وسکون کا گہوارا بنانے کے لیے غلط فیصلے کرنے والے تعصب زدہ اپاہج ذہنوں کو نظام سے باہر نکالنا وقت کا اہم تقاضا ہے- موجودہ دنیاوی طاقتوں کے کنٹرولرز مین پر انسانی امن وسلامتی میں انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر سکے اس وقت ہر مذاہب کے امن پسند قبل لوگوں کا جنگی سوچوں کے خلاف انسانیت بچاؤ مشن لے کر میدان میں اترنا نہایت ضروری ہے اسلام بھی اپنے مسلمانوں کو دنیا کے ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے انسانوں کو چادر محبت میں سلامتی کی پناہ دینے کا درس دیتا ہے:

تیرے ہی حالات سے ہے تیرا پریشان ہونا
ورنہ مشکل نہیں مشکل آسان ہونا

دو عالم پہ ہو تیری ہی حکومت اے مسلم
تو سمجھ جائے اگر اپنا مسلمان ہونا

☆☆☆☆☆

فاضل جمیلی ..... بہ حیثیت نظم گو شاعر

یہ حقیقت ہے کہ غزل کا پلّہ نظم کے مقابلے میں ہر دور اور زمانے میں بھاری رہا ہے، مگر ہمیشہ غزل کے بعد دوسرا نام نظم ہی کا لیا جاتا ہے۔ اکثر شعرائے اُردو نے تمام اصناف سخن میں غزل کو ترجیح اور اوّلیت دی ہے۔ یہ شعرائے اُردو کی مرغوب ترین صنفِ سخن رہی ہے۔ اِس کا ثبوت وہ سب سے بڑا ذخیرہ ہے جو امیر خسرو سے لے کر عہدِ حاضر کے شعرا نے دنیائے اُردو ادب کو بخشا ہے۔ ہر شاعر غزل پر فریفتہ رہا ہے۔ صرف چند اُردو شعرا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے غزل کے بجائے نظم کو ترجیح اور اوّلیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اُن کا نام بہ حیثیت نظم گو شاعر کے سامنے آتا ہے، مگر غزل گو شعرا کی اکثریت ایسے شعرا کی ہے جنھوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کہی ہیں۔

ایسے شعرائے کرام میں جنھوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کہی ہیں فاضل جمیلی کا شمار ہوتا ہے۔ اُنھوں نے نظمِ پابند اور نظمِ معریٰ کا پیکر رکھنے والی شاعری کی ہے۔ اُن کی پابند نظمیں خاصی توانا ہیں جن میں جدید افکار پوری توانائی کے ساتھ موجود ہیں جس موضوع کو اُنھوں نے بیان کرنا چاہا ہے اُسے انتہائی سلیقے اور خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اُن کی نظموں میں منظر کشی سب سے زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ اِس حوالے سے اُن کی نظمیں پڑھتے ہوئے قاری کے سامنے وہ منظر محسوس ہونے لگتا ہے۔ اُن کی نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات، شدید جذبات اور نازک احساسات کو بھی شاعرانہ جمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ اُن غیر مرئی اور غیر محسوس ہونے والی اشیا کو بھی صفحۂ قرطاس پر ایسے پینٹ کرتے ہیں کہ مجسم ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ ہنر ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اُن کی ایک نظم ''ارادے بدلتی ہوئی دوستی'' ملاحظہ فرمائیں تا کہ اُن کا

شاعر علی شاعر

اُسلوبِ بیان ہمارے سامنے آ سکے:

اُسے کیا خبر ہے!
کوئی اُس کے بارے میں کیا سوچتا ہے
وہ اپنے ہی خوابوں، خیالوں میں کھوئی
کبھی جاگتی اور کبھی سوئی سوئی
کوئی اور اسمِ وفا پڑھ رہی ہے
محبت کے دل میں اُترتی ہوئی
سیڑھیاں چڑھ رہی ہے

.....

وہ کیا جانتی ہے!
محبت کا آخر یہ کیا سلسلہ ہے
اُمیدیں کہاں سے جنم لے رہی ہیں
کہاں یہ جنم اپنا دم توڑتا ہے
جو پھول اُس کے دل میں اچانک کھلا ہے
کسی کی بہاروں بھری خواہشوں کی
یہ پہلی دعا ہے

.....

وہ کیا آشنا ہے!
دعا اور خواہش کا سُچوگ کیا ہے
خوشی ہم سے روٹھی ہوئی کس لیے ہے
ہمیں روگ کیا ہے
ارادے بدلتی ہوئی دوستی اور اٹل دشمنی میں
کوئی فرق ہے تو اُسے کیا غرض ہے
وہ اپنے ہی خوابوں، خیالوں میں کھوئی
کبھی جاگتی اور کبھی سوئی سوئی
خود اپنی ہی جانب چلی جا رہی ہے
محبت کو پھر بھولتی جا رہی ہے

.....

فاضل جمیلی جس طرح چاہتے ہیں اپنے جذبات کی منظر کشی کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے تلخ و شیریں تجربات کو بھی نظم میں سمونے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اُن کی کوئی بھی نظم مثال کے طور پر پیش کی جائے اُس میں مذکورہ بالا خوبیاں موجود ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ پختہ کہنہ مشق اور جدید نظم نگار اِس بات سے انکار نہیں کریں گے بلکہ فاضل جمیلی کی نظموں کو میری رائے کے مطابق محسوس کریں گے۔ جہاں اُنھوں نے پابند نظمیں کہی ہیں وہاں نظمِ معریٰ میں بھی زورِ بیان دِکھایا ہے۔ اور نظمِ معریٰ میں یہ اپنے ہم عصر شعرا سے نہ تو پیچھے رہے ہیں اور نہ کم زور ہیں، کیوں کہ اُن کی نظموں کے مصرعے ایک دوسرے سے مربوط و پیوستہ ہیں۔ اُن کے مصرعے اِس طرح مربوط و پیوستہ ہوتے ہیں جیسے کڑی سے کڑی مِل کر زنجیر بنی ہوتی ہے، اِسی طرح اُن کے مصرعے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے نظم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو قاری پر اثر انداز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دیگر نظم نگاروں کے اکثر جملے اِس لیے کم زور رہ جاتے ہیں کہ اُن کی نظموں میں مصرعے اور ٹکڑے دولخت نظر آتے ہیں۔ اُن میں ارتباط کا جھول ہوتا ہے۔ وہ کڑی سے کڑی مِلا کر زنجیر بننے کی حالت میں نہیں ہوتے۔ اِس لیے اثر پزیری کھو دیتے ہیں اور قاری تذبذب کا شکار ہو کر بیزار ہو جاتا ہے اور نظم کی قرأت موقوف کر

دیتا ہے، مگر فاضل جمیلی کی نظموں کے موضوعات کے اظہار میں کہیں بھی دولخت ہونے کا نقص نظر نہیں آتا اور اُن کی نظموں کی یہی خوبی سب سے اہم ہے جس نے اُنھیں اپنے ہم عصر نظم نگاروں سے منفرد و ممتاز کر دیا ہے۔

اُن کی ایک اور نظم ''گلی میں کھیلتے بچو'' ملاحظہ فرمائیں:

گلی میں کھیلتے بچو!
جواں ہونے سے پہلے سوچ لینا
زندگی مشکل نہیں لیکن
بہت مشکل جوانی ہے
جوانی مجھ پہ گزری ہے
مجھے معلوم ہے کردار کیسے قتل ہوتے ہیں
کہانی مجھ پہ گزری ہے
جہاں ظلم و تشدد کی سیاست ہی معیشت ہو
وہاں پر خون کی قیمت ہمیشہ صفر ہوتی ہے
جوانی میں قدم رکھنے سے پہلے
زندگی بے فکر ہوتی ہے
گلی میں کھیلتے بچو!
یونہی بے فکر ہی رہنا
کوئی جنگ و جدل کا اب تمہیں ایندھن بنائے تو

.....

اُسے اپنے لہو کا ایک قطرہ بھی نہ دینا تم
نظر کے سامنے اُٹھتی فصیلوں کو گرا دینا
دلوں کو بانٹ دیتی ہیں لکیریں سرحدوں کی
ان لکیروں کو مٹا دینا
رگ و پے میں بچھائی جا رہی ہیں جو
وہ بارودی سرنگیں صاف کر دینا
لہو میں دوڑتی پھرتی ہوئی یہ آبدوزیں
تم کو لے ڈوبیں گی ساتھ اپنے
انہیں اپنے ہی سینے میں کہیں غرقاب کر دینا
کبھی بھی اپنا جوہر
جوہری ہتھیار میں تبدیل مت کرنا
زمانوں، لامکانوں سے بھی آگے ہے مقام اپنا
کسی بھی ہم نفس کی تم کبھی تذلیل مت کرنا
گلی میں کھیلتے بچو!
گلی میں کھیلتے رہنا
لہو کے ساتھ مت بہنا...!!

.....

فاضل جمیلی کی نظمیں، نظم کی خوبیوں سے نابلد لوگوں کے لیے غیر اہم ہوں گی، مگر سلیم الحواس، زیرک اور طبّاع شعرا اُن کی نظموں کے اوصاف کے گرویدہ ہوں گے، کیوں کہ وہ نظموں کی خوبیوں کو جانتے ہیں اور فاضل جمیلی کی نظموں میں اُن خوبیوں کو پہچانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شاعرِ موصوف کی نظموں کے قارئین میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اُن کی متعدد نظمیں مرقع کشی کی آئینہ دار ہیں اور شفاف و شستہ الفاظ میں محاکاتی انداز لیے ہوئے ہیں۔ اِس انفرادیت کے سبب فاضل جمیلی کی عظمتِ شاعرانہ مسلّم ہو جاتی ہے اور اُنھیں تقدم حاصل ہو گیا ہے۔ اگر دنیائے اُردو ادب کے اسلاف شعرا کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں آج غالب سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے

معاصرین میں فکر و موضوعاتِ سخن اور اُسلوبِ نو کے لحاظ سے سب سے منفرد و ممتاز ہو گئے ہیں۔ شاعرِ موصوف کی نظموں کو فکر و موضوعات اور اُسلوبِ نو کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اُن میں ندرتِ خیال بھی ہے اور تخیل کی پرواز بھی بہت بلند ہے۔ اُن کا اُسلوبِ بیان بھی تازہ ہے اور اُس میں نیا پن داخل ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اُن کی نظموں کو جدّت کے حصار میں لاتے ہیں، کیوں کہ اُن میں منظر نگاری اور حُسنِ بیان کی رنگارنگی موجود ہے۔ فاضل جمیلی کی نظمیں سادہ بیانی کی زندہ مثال ہیں اور اُن میں سہلِ ممتنع اپنی تمام تر شگفتگی لیے ہوئے ہیں۔ دراصل وہی نظم گو کامیاب رہتا ہے جو اپنا مافی الضمیر شفاف و شستہ اور شگفتگی کے ساتھ بیان کر سکے۔ فاضل جمیلی نے اپنی نظموں کو اِنھیں اوصاف سے زینت بخشی ہیں جو قابلِ قرأت و سماعت بھی ہیں اور قابلِ ستائش بھی۔

میرے خیال میں سندھ کے ادبی منظر نامے پر جم کر نظم کہنے والوں میں چند ہی نظم نگار ہیں جن کی نظموں میں شدّت پائی جاتی ہے، اُن میں سب سے اہم نام فاضل جمیلی کا ہے۔ فاضل جمیلی کا پہلا شعری مجموعہ ''کمنام آدمی کا بیان'' شائع ہوا تو اُس میں بھی شاعرِ موصوف نے نظموں کے ساتھ غزلیں بھی شامل کی ہیں، مگر نظموں کو اوّلیت دی ہے۔ میں نے اُن کی نظموں کا بہ غور مطالعہ کیا ہے اور پاکستان کے نمائندہ نظم نگاروں کے کلام کے سامنے رکھ کر پرکھا بھی ہے اور اِنتقاد کی کسوٹی پر کس کا دیکھا بھی ہے۔ لہٰذا اُن کی نظم نگاری سے متعلق میری اِنتقادی رائے یہ ہے کہ اُن کی نظموں میں سادہ بیانی بھی ہے اور اُنھوں نے اِن میں اپنے تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات، نازک احساسات اور کیفیات کو بڑے لطیف اور مؤثر انداز میں مصور کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں میں سادگی حُسنِ ادا بن گئی ہے۔ اُن کی نظموں میں فکر و خیال اور موضوع کی خوبی نے اپنے آپ کو منوایا ہے اور خیال آفرینی اور فکر انگیزی نے قارئینِ شعر و سخن، ناقدینِ فنِ شاعری اور مشاہیرِ اُردو ادب کے ساتھ طالبانِ علم و ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ اُن کی ہر نظم حُسنِ بیان کا وہ شفاف آئینہ ہے جو ابلاغ و ترسیل کے جوہر سے مزین ہے اور ہر نظم کے کردار کا عکس بڑا واضح اور صاف دِکھاتا ہے۔

فاضل جمیلی کی شاعری پر پاکستان کی قد آور شخصیت جناب شکیل عادل زادہ نے جن الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے پیشِ خدمت ہے:

''محبوب خزاں نے کیا خوب کہا تھا:

بات یہ ہے کہ آدمی شاعر
یا تو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا

.....

شاعری کی پہلی شرط شاعری کی خداداد

صلاحیت ہے - اس کے بعد بہت سے مرحلے ہیں، صرف ودیعتِ خداوندی نہیں شاعری تو مکمل ایک ضابطے سے ممکن ہوتی ہے، اور ان ضابطوں، قاعدوں کے لیے بڑی جست جو لازم ہے ابتدا میں کسی سے کچھ اچھے شعر سرزد ہو جائیں تو حالات کیسے ہی ہوں، شاعری سے اُس کا پلٹنا، پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے-

فاضل جمیلی سر بہ سر شاعر ہیں- اُن کا بس چلے تو وہ کوئی کام ہی نہ کریں، صرف شعر کہیں، شعر سنائیں اور داد پائیں اور یہی کچھ سرمایۂ حیات سمجھیں- مگر فاضل بھی بے شماروں کی طرح بہ جبر ایک توازن قائم کیے ہوئے ہیں- گو یہ توازن اتنا یقینی اور حتمی بھی نہیں ہے- شاعری اُنھیں ورغلاتی اور بھٹکاتی رہتی ہے اور وہ بہک بہک جاتے ہیں- بہ ہر حال کچھ وقت جائے گا کہ یہ توازن خود بہ خود ممکن ہو جائے گا-

میری اُن سے ملاقات کوئی نئی نہیں لیکن اصل ملاقات 2016 کی ریختہ کانفرنس میں دلّی اور کلکتے کے سفر کے دوران میں ہوئی- کہتے ہیں، کسی کو پرکھنا ہو تو اُسے ہم طعامی، یعنی دسترخوان پر ساتھ بٹھا دو یا اس کے ہم سفر رہو- دس دن تک ہم دونوں ساتھ کھاتے، پیتے اور مٹر گشتیاں کرتے رہے اور میں نے دیکھا کہ اُن میں کیسا صاف، سچا، غمگسار اور ہمدرد اور کیسا باغی (سرکش نہیں) آدمی چھپا ہے- جو اچھا آدمی ہوگا، وہ تخلیق کار بھی اُتنا ہی اچھا ہوگا- فاضل جمیلی بنیادی طور پر ایک ذہین آدمی ہیں، چالاک نہیں- چالاک آدمی شاعر نہیں ہو سکتا- میرے ساتھ وہ کلکتے کے بازاروں میں بیوی بچوں کے لیے تن دہی سے شاپنگ کرتے رہے، ناریل کا پانی پیتے اور رس گلے کھاتے رہے اور سونا گاچھی کی زیارت کے لیے ترستے رہے- شاپنگ میں اُن کا معصومانہ اضطراب دیدنی تھا- اس صورت حال میں وہ محض شاعر قطعاً نظر نہیں آئے-

اور وہ شاعر کیسے ہیں- کسی سند کی ضرورت نہیں- سند یہ مجموعہ (گمنام آدمی کا بیان) ہے- شاعری کے مجموعے آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں، لیکن یہ ایسا مجموعہ نہیں جسے ورق گردانی کر کے شیلف میں سجا دیا جائے یہ ایک خیال آفریں مجموعۂ کلام ہے، خود کو پڑھواتا اور منواتا ہے- شاعری تو اُردو میں بے تحاشا ہوئی ہے اور ہو رہی ہے مگر یہ سوز و گداز، یہ جدت طرازی، نکتہ رسی، ایسے پُر خیال اشعار شاذ شاذ دستیاب ہوتے ہیں - کیسے کیسے زاویوں سے فاضل جمیلی نے یہ نظمیں، غزلیں تخلیق کی ہیں- باقی رہے دیگر اں معاملے- زندگی کے روز و شب، تو بہتر ہے، اُن کے خانہ نشینوں سے تفتیش کی جائے-''

ان کی ایک اور نظم ''گمنام آدمی کا بیان'' ملاحظہ ہو:

میں تو گمنام ہوں
میں تو کچھ بھی نہیں
ٹیلے وژن کا اینکر نہ مکار واعظ،

نہ دیوانِ عالی کا قاضی کوئی
ہم نوالہ نہیں لشکرِ خود کشی
زندگی کے تصرف میں بھی، میں نہیں
ایک دفتر کی ٹیبل پہ کہنی دھرے
کھینچتا ہوں فقط سوچ کے دائرے
دائروں سے کہاں کوئی دُنیا بنی
فائلوں میں پڑے اپنے دُکھ جھاڑ دوں
اب تلک جو لکھیں، عرضیاں پھاڑ دوں
کچھ بنا تو یہی اِک تمنا بنی
اور تمنا بھی کیا...!

.....

اپنی ہی قبر پر آپ جلتا ہوا جس طرح اِک دیا
جیسے حرفِ تسلی سے باندھا ہوا ہو دلِ مبتلا
اے دلِ مبتلا...!
اِس سے پہلے کہ ہو جائے تُو بے صدا
رُوح کی ہر شکن، ہر گرہ کھول دے
میرا سچ برسرِ انجمن بول دے
مجھ سے منسوب جو کچھ صحافت کرے
کوئی مُلا کسی کی دلالت کرے
نام پر میرے کوئی سیاست کرے
یا یہی کام کوئی عدالت کرے
میں کسی خود نمائی میں شامل نہیں
میں تو گمنام ہوں
میں تو کچھ بھی نہیں.....!

.....

مذکورہ بالا نظم کا ہر مصرع نہ صرف رواں ہے بلکہ شگفتہ اور شستہ لفظیات کا عکاس و ترجمان بن گیا ہے۔ فاضل جمیلی کی نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بیان کی ژولیدگی کو نہیں اپناتے اِسی لیے اُن کی نظموں میں ن م راشد، میراجی اور تصدق حُسین خالد جیسی سلاستِ بیان در آئی ہے۔ وہ آغاز ہی سے اِس ڈگر پر چل رہے ہیں اور یہی روش اُن کی پہچان بن گئی ہے۔ اُنھیں غزل گو شعرا کی طرح نظم میں شعریت سمونے کا فن اور غنائیت پیدا کرنے کا ہنر آتا ہے۔ اُن کی یہی خوبی اُنھیں اُن کے ہم عصر اور ہم عمر نظم نگاروں میں امتیازی حیثیت عطا کرتی ہے۔ فاضل جمیلی جس عنوان پر نظم لکھتے ہیں اُس ماحول کی منظر کشی اتنی اثر انگیز ہوتی ہے کہ قاری اُن کے مناظر میں کھو سا جاتا ہے اور اُن کی نظم کے ساتھ ساتھ دُور تک نکل جاتا ہے۔ اُن کی نظموں کے مصرعے اُن کے بیان کردہ منظر کو واضح طور پر قاری کے سامنے لے آتے ہیں۔ اُن کی نظمیں رومانی ہوں یا محاکاتی تمام کیفیات حقیقی سے بھرپور ہوتی ہیں اور اُن میں سہلِ ممتنع کا شفاف پن اپنا جلوہ دِکھاتا ہے۔ وہ اپنی ہر نظم میں اپنے جذبات کا توازن برقرار رکھتے ہیں۔ اُن کی نظموں کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ ہیجان خیزی، رکیک خیالات، سفلی جذبات اور جنسی لذات سے عاری اور بالکل پاک ہوتی ہیں۔ اُن کی نظموں میں احساسِ جمال بڑے بھرپور انداز میں موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

فخر عباس سے ''ملتی رہا کرو''

اے شاعر، اے دوست، اے مسیحا کچھ باتیں کرنے آیا ہوں، کچھ پوچھنا ہے، کچھ بتانا ہے، ارے شعرا کی بھیڑ میں اپنی الگ شناخت بنانے والے تمہارے ایک شعر:

یہ جو لاہور سے محبت ہے
یہ کسی اور سے محبت ہے

.....

نے تمہیں اس سنگھاسن پر بٹھا دیا ہے کہ دوستوں کو رشک آتا ہے اور بہت سے لوگ حسد سے دوچار ہیں جب بھی لاہور کی شاعرانہ بات ہوگی یہ شعر سرِفہرست دمکتا نظر آئے گا۔ ارے یار! میرے اشعار، میرے بچے یاد نہیں رکھتے پر یہ شعر انہیں ازبر ہے۔ یہ وہ محبت ہے جو بہت کم شعرا کے حصہ میں آتی ہے۔ یہ قدرت کی عطا ہوتی ہے اور تمہیں عطا ہو چکی۔

اب تم کسی سے کہتے لگے ہو کہ ملتی رہا کرو

یہ بتاؤ کہ کس سے مخاطب ہو یہ وہی لاہور والی اور ہے یا

''اور سے اور ہوئے درد کے عنواں جاناں''

والے حالات ہیں

غزل کہنا سہل دکھتا ہے پر ایک دشوار عمل ہے۔ تمہاری غزل کی لطیف رمزیت، اس کا الگ ذو معنوی شائستہ شرارتی انداز، محبت میں گندھی ہوئی شاعرانہ چاندنی قاری کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے، تم نے بہت آسان کر دیا ہے شاعری میں محبت کی بات، ملاقات کو اور یقین مانو اس آسان شاعری کا اپنا الگ سندر جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے اور تم اس جادو کے جنتر منتر خوب جانتے ہو۔ اے ہمہ وقت ہونٹوں پر مسکان سجائے پُرخلوص مسیحا، جادوگر تم کہ نبضِ انسانی کی رفتار سے خوب واقف ہو، فشارِ خون کو بھی سمجھتے ہو، دل کی سازشوں کا ادراک ہے تمہیں اور درد جاں کی تکلیف سے پوری طرح شناسا ہو اس لئے طبی معائنہ بھی خوب کرتے ہو اور اچھے ہونے کی سند بھی اس طرح دیتے ہو:

اُس نے پہنا لباس اچھا ہے
دوست میرا وہ خاص اچھا ہے

شاہد فرید

آنکھ اچھی ہے ، ناک اچھی ہے
ہونٹ اچھے ہیں ، ماس اچھا ہے

گال ڈمپل سے ہے سجا اُس کا
تلِ بھی ٹھوڑی کے پاس اچھا ہے

.....

تمہاری مسیحائی میں دوا کے ساتھ دعا بھی ملتی ہے اور یہ دعا مشورہ فیس میں شامل ہے سو تو کہتے ہو:

کرتی ہے مجھ سے مشورے جانِ ادا بہت
کرتا ہوں اُس کے واسطے میں بھی دعا بہت

.....

اب یہ نہیں معلوم کہ یہ دوا کے ساتھ دعا کی سہولت صرف جانِ ادا کو حاصل ہے یا سب کے لیے ہے۔

اے اِدھر، اُدھر سفر کرتے شاعر تم اپنے ساتھ اپنے قاری کو بھی شہر شہر لئے پھرتے ہو، کبھی لاہور، کبھی ساہیوال، کہیں خوشاب، ملتان یا کشمیر میں محبتیں بانٹتے رہتے ہو، تک کر کیوں نہیں بیٹھتے، میں تو کہوں گا:

اتنی آوارگی تھکا دے گی
ہمسفر ساتھ چھوڑ جائیں گے

.....

کچھ دیر کو دم بھی لے لو پیارے پہلے کہا:

یہ جو لاہور سے محبت ہے
یہ کسی اور سے محبت ہے

پھر بولے:

ربط اس کو بہت ملال سے ہے
ایک لڑکی جو ساہیوال سے ہے

یہاں سے اور جانب نکل کھڑے ہوئے:

ریت اور گرمی تحفے جو خوشاب کے ہیں
تیری خاطر یہ بھی اپنی تاب کے ہیں

.....

کہیں گجراتی خاطر داری میں لگ گئے:

جب وہ اچھا کھاتی ہو گی
یاد تو میری آتی ہو گی

میٹھا دل بہلاتا ہو گا
مرچ اُسے تڑپاتی ہو گی

اتنی پیاری آنکھوں والی
وہ لڑکی گجراتی ہو گی

.....

اور پھر اعتراف آوارگی بھی خوب کیا کہ:

مزاجِ محبت میں سد پارگی ہے
تبھی ہم مہمات کا سوچتے ہیں

.....

اے ہونٹوں پر سدا مسکراہٹ سجائے ہوئے دل میں کئی درد لئے پھرتے شخص تم کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے مگر اشعار میں سب عیاں کر دیتے ہو اپنے اردگرد کا کرب، زندگی کی تلخیاں اور دردِ دل و کربِ جاں کے گرد بڑی ذہانت، مہارت سے شاعرانہ چادر پھیلا دیتے ہو:

تم اک بات سمجھتے ہو پر شاعر نے
دل کا کوئی زخم دکھایا ہوتا ہے

درد ہوا سونے سے پہلے
ایک غزل ہونے سے پہلے

لہر اٹھی سینے کے اندر
نین جلے رونے سے پہلے

ایسا آساں تو نہیں چیخنا چلانا بھی
درد ہوتا ہے تو ہم آہ و فغاں کرتے ہیں

.....

نئے خواب بھی بُنتے رہتے ہو اور
خوبصورت خواہشیں سنبھال رکھی ہیں دل
میں اور اُن خواہشات کے کھلتے رنگ
کینوس پر اشعار کی صورت پھیلا دیتے ہو:
گلاب ہوتے، چراغ ہوتے، ستارے ہوتے
ہماری خاطر کسی نے گیسو سنوارے ہوتے

اگرچہ خوش ہیں ہم اپنے جیون کی ہر عطا سے
تمہیں جو دیکھا تو سوچتے ہیں کنوارے ہوتے

ایک تو جھمی ڈال کے تجھ سے ملنا ہے
اور بھی کچھ ارمان دل بیتاب کے ہیں

پیار کا بدلہ پیار سے دینا بنتا ہے
سوچ رہا ہوں تیرا کتنا بنتا ہے

بوسہ دوں گا میں تیری پیشانی پر
پہلی بار ملیں گے تحفہ بنتا ہے

.....

یہ شاعری کا کمال ہے اور ایک جرأتِ
رندانہ، جس پر دوست تمہیں تو داد ملتی
ہے۔ مگر میں اپنے لئے کسی سے ایسے
اظہار پر جواباً:
گھونسہ دوں گی میں تیری پیشانی پر
ایسی بات پے ایسا تحفہ بنتا ہے

.....

جیسے خطرے کی امید رکھتا ہوں۔
اور خاص منظر کو جس محبت بھری آنکھ سے
نکھارتے ہو تو یقیناً منظر بھی، صدقے
واری جاتا ہوگا، اور کیوں نہ یہ سُن کر:

مشک پس رخسار بھی اچھی لگتی ہے
زلف کی یہ مہکار بھی اچھی لگتی ہے

ہاتھ پے ہاتھ رکھے وہ چاہے بیٹھی ہو
گھر میں وہ بیکار بھی اچھی لگتی ہے

.....

جب غزل اپنے منفرد لب و لہجے اور محبت بھری
مسکراہٹ سے بیاں کرتے ہو تو ہر منظر ہر قلبی
واردات اور جذبات تمہاری آنکھوں سے جھانکتے
ہیں۔ پوری کتاب میں اُس اور کو اشعار کے
خوبصورت ریپنگ پیپر میں لپیٹتے رہے ہو مگر آخری
شعر میں ایک نام بتا گئے صبا اب اس کو بھی بادِ صبا
کہہ کر مکر جاؤ گے، کہیں یہ یادِ صبا تو نہیں ہے۔
خواب ہو ایسا کہ کھل جائے دریچہ دل کا
لمس پھولوں کا ملے، باد (یاد) صبا کی آئے

.....

اب تمہی بتا سکتے ہو ایسا ہی ہے یا نہیں،
تمہاری کتاب کے اِس آخری شعر کے
ساتھ، چند اشعار تمہاری نظر اور پھر اجازت:

خوب تر ہے کلام چاہت کا
فخر عباس کی محبت کا

اِس سے "ملتی رہا کرو" اے "اور"
جب کوئی پاؤ لمحہ فرصت کا

چاہتیں سب سنبھال کر رکھنا
یہ ہے سامان دل کی راحت کا

سونے اُوراق پر بکھیرا ہے
رنگ تو نے خلوص و الفت کا

محفلِ یار میں رہے رونق
میں بھی شاہد رہوں مسرت کا

☆☆☆☆☆

موکش: مرگ سے مکتی تک

موت بظاہر جتنی سادہ حقیقت دکھائی دیتی ہے اپنے باطن میں اتنے ہی زیادہ سوالات لیے زندگی کے ساتھ ساتھ ایک سائے کی طرح چلتی رہتی ہے۔ اس سے جڑے اسرار زمین دوز گپھاؤں کے بے انت سلسلے کی طرح ہیں جتنا بھی آگے بڑھو یہ پھیلتے ہی جاتے ہیں۔ ہم اکثر اس پیچھا کرتی بلا کو بھلا کر اپنے سائے کو پیچھے چھوڑ دینے کے دھوکے میں مبتلا سرپٹ دوڑے چلے جاتے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ جس سے بھاگ رہے ہیں اسی کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ مگر پھر کئی موڑ، مقام یا برس ایسے بھی آتے ہیں جب دفعتاً ہمارے ساتھ دوڑنے والے کئی ساتھی ایک ہی وقت میں یا مختصر وقفوں کے دوران چھن سے نکل لیے جاتے ہیں۔ تب ہمیں شدت سے اس بے نیازی سے مسکراتی بلا پر غصہ آتا ہے یا بے بسی اور جھنجھلاہٹ کہہ لیں اور ہم رُک کر گردن موڑ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات کرتے ہیں۔ شاید ایسے ہی کسی موقع پر اس ناول کے تصور نے ناول نگار کے دل کو چھوا ہوگا۔ گردن موڑ کے دیکھنے کا یہی ایک لمحہ ہے جو میرے خیال سے ناول کی تخلیق کے لیے پہلی دستک کا کام کرتا ہے اور پھر اپنے آپ میں پھیلتا چلا جاتا ہے: جیسا کہ میں اوپر بھی کہہ چکی ہوں کہ بظاہر یہ ایک سامنے کی سیدھی سادی حقیقت ہے مگر ایسے ایسے سوالات پیدا کرتی ہے کہ جن کے لیے انسانی دماغ ابھی تک کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا۔ اس ضمن میں حتمی نتیجہ ایک ہی ہے اور وہ ہے اس کا لازمی پن۔۔۔ کب، کہاں اور کیسے کے جھگڑوں سے ادھر بس اتنا کہ اس کا ہونا طے ہے:

”کیا انسان کا اختیار اس حد تک ہے کہ وہ اپنی موت کے لیے جگہ کا انتخاب کرے؟
کتنے لوگ اس اختیار کو استعمال کر پاتے ہیں؟ اپنی جگہ یہ الگ سوال ہے۔“

یہ سوال ناول کی کلید ہے اور اس سوال سے ملاقات ناول کے ابتدائی حصے میں ہی ہو جاتی ہے۔ بعد کے صفحات اس سوال کو الٹا پلٹا کر اور شاید آزما کر دیکھے جانے کے عمل کا نتیجہ ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ناول میں ایک دوسرے کے متوازی دو دھارائیں شروع سے آخر تک چلتی ہیں۔۔۔ ایک طرف موت کو پرسونیفائی کر کے، اس کی اپنی زبانی اسی سے جڑے کچھ فکری، سماجی اور تاریخی حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ مختلف تہذیبوں اور مذاہب نے اس حقیقت کو کن کن زاویوں سے دیکھا، اس کا بیان بھی مجھ ایسے قاری کی توجہ کھینچتا ہے:

گلناز کوثر

''میں انسان کو اس کے اصل سے ملاتی ہوں۔ جب وہ مر جاتا ہے تو اسی مٹی میں دوبارہ چلا جاتا ہے جس میں سے اس نے وجود پایا تھا۔ اس میں اور مٹی کے درمیان میں، میں ہی ایک واسطہ ہوں۔ میرے بغیر کبھی وہ اپنی اصل میں نہیں مل سکتا، مگر وہ مانتا نہیں ہے۔''

ناول کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور اس کی ترتیب کچھ اس طرح رکھی گئی ہے کہ ہر دوسرا باب ''میں موت ہوں'' کی سطر سے شروع ہوتا ہے اور پھر سلسلہ وار کرونولوجیکل انداز میں موت سے متعلق شروع سے اب تک کے انسان کا ذہن ٹٹولتا چلا جاتا ہے۔ بات جسم کی موت سے چلتی ہے موکش تک پہنچتی ہے۔ موکش یعنی مکتی جو کہ ناول کا ٹائٹل بھی ہے، بذات خود یہ لفظ ایک پورے مضمون کا تقاضا کرتا ہے۔ مختصراً اتنا ہی کہ ہندو دھرم میں 'موکش' کا مطلب سات جنم کے بعد روح کا ایشور سے مل جانا ہے جبکہ بدھ مت کے ہاں اسے روح کی میچورٹی یا بالیدگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ صوفیاء کے ہاں رائج نظریے سے ملتا جلتا ہے کہ روح ایک بلند سطح پر تمام کثافتوں سے پاک ہو جاتی ہے۔ یہیں کہیں وہ پڑاؤ ہے جہاں رُک کر مصنف نے موت کے سفر پر نکلے جسم اور روح کو الگ الگ کر کے دیکھا ہے۔ اپنے اردگرد ہونے والی مرگ کے ایک سے زیادہ واقعات نے اسے احساس دلایا ہے کہ ایک سطح پر جب روح میچور ہو جائے اور انسان اپنے بھیتر خوب گہرائی میں اترنے کے قابل ہو جائے تو ہاں اُسے موت اپنی جانب دھیمے قدموں آتی دکھائی دیتی ہے اور یہ بھی کہ اس سطح پر وہ اپنی موت کے وقت اور جگہ کا تعین بھی کر سکتا ہے۔ راحت وسیم کے آخری سفر کی تفصیلات دراصل ہمیں مصنف کے اس نظریے سے ملواتی ہیں اور حیرت انگیز دلچسپی سے ہم مصنف کو روحانی مدارج کھنگالتے دیکھتے ہیں۔ ایسے دور میں جب بات انٹرنیٹ سے آرٹی فیشل انٹیلی جنس تک جا پہنچی ہے، یہ سب بہت خوابناک سا لگتا ہے۔ موت کے متوازی جو دوسری دنیا کھڑی کی گئی ہے وہ آج کے زمانے کی کہانی ہے۔ اس کہانی کے کردار ناول نگار نے اپنے بہت قریب سے اٹھائے ہیں اور ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والے دوستوں کے لیے انہیں پہچاننا کافی حد تک ممکن بنا دیا ہے۔ شاید مصنف کی یہی خواہش تھی کہ ہم جان ہی جائیں کہ وہ آخر کن لوگوں کی بات کر رہا ہے۔ یا اپنے بنائے تھیسز کی سپورٹ کے لیے بھی کرداروں کو مکمل چھپایا نہیں گیا ہے بس ایک مہین سا پردہ سرکا دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ بھی میری طرح مصنف کے اس نظریے سے قطعی اتفاق نہ کریں کہ انسان اپنے مرنے کے وقت اور جگہ کا تعین کرنے پر قادر ہے۔ پھر بھی جس طرح مصنف نے اپنے اردگرد پھیلے مختلف واقعات سے نتائج اخذ کیے ہیں وہ سب انتہائی دلچسپ لگتا ہے اور آخر تک آپ کہانی سے جڑے رہتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی فینٹسی ورلڈ میں ایک تجسس گلیوں گلیوں لیے پھرتا ہو۔ ہم اظہر نفیس کی روح کے ساتھ ساتھ گھومتے ہیں اور شعری و ادبی جہان میں در آنے والے دنیا دارانہ رذیوں پر کڑھتے ہیں۔ کیسے سرکاری ادبی رسالوں کے دفاتر آہستہ آہستہ ادیبوں کے سفارت خانے کی جگہ عام سرکاری دفاتر بن کر رہ گئے ہیں:

''سرکاری ادبی رسالے کے دفتر میں بے مقصد گھومتے ہوئے اظہر نفیس مدیر اعلیٰ کے کمرے

میں بھی چلا گیا۔ کیسی کیسی ادبی شخصیات اس کمرے میں بیٹھا کرتی تھیں۔ ان کی تصویریں کمرے کی مشرقی دیوار پر لگی ہوتی تھیں۔ جہاں سورج کی کرنیں صبح دم ان کے چہروں کو روشن کرتیں۔ مدیر اعلیٰ کے دفتر کی مشرقی دیوار کی جانب دیکھ کر ایک بار پھر اُسے مایوسی ہوئی۔ جہاں تصویریں ہونا چاہییں تھیں۔ وہ جگہ خالی تھی۔ مدیر اعلیٰ کے نام کے آگے کسی بیوروکریٹ کا نام اور سکیل لکھا گیا تھا جس کا ادب، شاعری اور زبان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس مسند پر بیٹھ کر کوئی غیر ادبی شخص اپنے فرائضِ منصبی سے کیسے انصاف کر سکتا ہے۔''

ناول کے اس حصے میں مصنف بڑی خوبصورتی سے ادبی فضا میں رہتے ہوئے تیس چالیس برس قبل کے دور کا موازنہ زمانہ حال سے کرتا ہے اور قاری کو بھی اس ناسٹیلجک ماحول میں لے جانے میں کامیاب رہتا ہے۔ اس کی نظر سے ہم موجودہ ادبی ماحول کا جائزہ لیتے ہیں اور اسی کی دہائی کے شاعروں اور ادیبوں کی نفسیاتی و جذباتی گتھیوں پر بھی نظر ڈالتے ہیں:

''راحت وسیم اور احسن جمال کی نسل کے شاعر و ادیب دیکھتے ہی رہ گئے! یہ الگ قسم کا ڈپریشن تھا جو ان سب کے لیے غیر متوقع تھا۔ کچھ صحافیوں نے بھی ادبی تقریبات ہائی جیک کرنا شروع کر دیں۔ لٹریری فیسٹیول کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا کہ جن کے منتظمین میں سرمایہ دار تھے۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے سپانسر جیبوں میں لیے یہ لوگ الحمرا آرٹ کونسلوں میں آ گھسے۔ ایوان صدر میں راحت وسیم مشاعرہ پڑھ آیا مگر بات بن نہیں رہی تھی۔ ابھی وہ ان لال ٹائی والوں سے نمٹے نہ تھے کہ نوجوانوں کے ایک گروہ نے سوشل میڈیا کے ذریعے لاکھوں کی تعداد میں اپنے ناظرین میں اضافہ کر لیا۔ یہ نوجوان جہاں مشاعرہ پڑھنے جاتے، سوشل میڈیا پروڈیوکلپس کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع پہلے ہی دے دیتے۔ کالجوں کے لڑکے اور لڑکیاں مشاعرہ گاہ پہنچ جاتیں اور ان کی شاعری پر داد و تحسین کے نام پر وہ نعرہ بازی ہوتی کہ آٹھویں دہائی کے ان شعرا کا کلام قبولیت حاصل نہ کر پاتا۔ یوں لگتا جیسے وہ اور ان کا کلام وقت سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔''

یہیں کہیں اسی دنیا میں ہماری ملاقات مصنف سے بھی ہوتی ہے۔ بوجھل دل سے، گئے ہوئے دوستوں کا ذکر کرتے، ان سے جڑی باتوں اور یادوں کو ناول کے صفحات میں قید کرتے، ان کے دکھ سکھ پھرولتے ہم اسے بخوبی پہچان لیتے ہیں۔ ناول کا انجام بہت خوبصورت ہے جہاں مصنف ناول کے ایک کردار کے پردے میں ہم سے مخاطب ہوتا ہے اور اپنے نظریے کے درست ہونے کے ضمن میں یہ دلیل لاتا ہے کہ اگر اس کی موت نے اسے فلاں وقت اور جگہ پر آن دبوچا تو سمجھ لیا جائے کہ اس کا نظریہ درست تھا۔ قاری کچھ لمحے ضرور سوچتا ہے اپنی یادداشت ٹٹولتا ہے؛ ایسے کسی واقعے کے لیے، ایسی کسی مرگ کے منظر کے لیے، جو مصنف کے نظریے کو سچ ثابت کرتا ہو۔ بھیڑ بھاڑ اور شور شرابے کی اس فضا میں موشن اندر کے جہانوں کی دریافت کا خوبصورت سفر ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر سید قاسم جلال ..... ادب دوست ادب نواز.....

ڈاکٹر سید قاسم جلال سے غائبانہ تعارف تو کافی عرصے سے تھا۔ان کی تحریریں مختلف جرائد میں نظر سے گزرتی رہتی تھیں۔ بہاول پور سے شائع ہونے والے حقیقت میگزین میں بھی ان کی تحریریں عرصہ 20 سال سے پڑھ رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بہاول پور کے رہائشی ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصے سے ملنے کی خواہش تھی۔ جو فروری میں پوری ہوگئی۔ ایک خاتون رائٹر سے ان کا ایڈریس اور فون نمبر لیا۔ انھی سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب سادہ موبائل استعمال کرتے ہیں اور وہ بھی مخصوص وقت کے لیے۔ چنانچہ ان کا ایڈریس لیا اور پھر کچھ کوشش کے بعد ان کے پاس پہنچ گئے۔ کوشش اس لیے کہ کال کیے بغیر گئے تھے۔ خلاف توقع گیٹ انھوں نے ہی کھولا۔ اپنا تعارف کروایا تو فوراً پہچان گئے۔ مجھے بھی ''حقیقت'' کی وجہ سے جانتے تھے کہ اس میں لکھتے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے۔ بڑی محبت اور دھیمے لہجے سے گفتگو کرنے والے ڈاکٹر سید قاسم جلال کی شخصیت میں مجھے وہ چیز نظر آئی جو حقیقی ادیبوں میں ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ وہ سادہ موبائل کا استعمال بھی اسی لیے کم کرتے ہیں کہ زیادہ وقت لکھنے پڑھنے کو دیتے ہیں۔ اس ملاقات میں انھوں نے دیگر کتابوں کے ساتھ اپنی یہ کتاب بھی پیش کی، جو اس وقت میرے سامنے پڑی ہے۔ ''اکیسویں صدی کا اقبال، ڈاکٹر سید قاسم جلال''۔ یہ دراصل سید جمال کی تحریر کا عنوان ہے، جو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت پر لکھی تھی اور اسے کتاب کا عنوان بنا دیا گیا۔ شفیق الرحمٰن الٰہ آبادی نے ان کی شخصیت پر ایک بھرپور کتاب مرتب کی ہے۔ تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں معروف ادیبوں و شاعروں کی

رانا محمد شاہد

وہ تحریریں شامل ہیں۔ جو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت یا ان کی تحریروں پر لکھی گئی ہیں۔ تاہم زیادہ تر تحریروں میں ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں فکر اقبال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے مرتب کنندہ شفیق الرحمٰن اللہ آبادی اپنے ابتدائیے میں اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

''میں نے جب اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے (اردو شاعری میں فکر اقبال کی توسیع) کے حوالے سے اقبال اور جلال کے کلام میں مشترک موضوعات کی تلاش کے لیے جستجو کی تو مجھے نہ صرف ان کے کلام میں فکر اقبال کے حوالے سے اشعار ملے بلکہ ایسے ناقدین کے بہت سے مضامین بھی مل گئے جن میں ڈاکٹر سید قاسم جلال کو بطور اقبال شناس یا فکر اقبال کے توسیع کار ہونے کے حوالے سے موضوع بنایا گیا تھا تو میں نے ان تمام مضامین کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کتاب میں راقم الحروف سمیت ملک کے معروف اور جید ادبا و ناقدین کے ایسے مضامین اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ آرا کو شامل کیا گیا ہے۔ جنھوں نے ڈاکٹر سید قاسم جلال کی شاعری میں فکر اقبال کا عمیق نظری سے سراغ لگایا ہے''۔

اس کتاب میں سید قاسم جلال پر جن جن شخصیات کی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر شاکر کنڈان، سبط جمال، پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان، منظر عارفی، پروفیسر قدرت اللہ شہزاد، ڈاکٹر نجیب جمال، ڈاکٹر اسلم فرخی، خورشید بیگ میلسوی، شاعر علی شاعر، بیگم خورشید حفیظ جالندھری، سید تابش الوری، پروفیسر زہیر کنجاہی، ڈاکٹر معین نظامی، سید شہاب دہلوی، پروفیسر جمیل احمد عدیل، حسین سحرائی، پروفیسر ذیشان تبسم اور دیگر کئی نام شامل ہیں۔ کتاب میں بورے والا سے وابستہ معروف محقق و نقاد جمیل احمد عدیل کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ جمیل احمد عدیل اپنی تحریر میں لکھتے ہیں۔ ''ان کی نظمیں ''شہادت حسین کی'' اور ''شہید کربلا'' پڑھیں تو ان کی اس بات پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ وہ شاعری بے روح ہے۔ جس کی اساس حقائق پر نہیں اور حقیقت وہی ہے جو جور و جفا اور اعدائے حق کے سامنے حق کو حق کہتی ہے۔ گردن کو خم نہیں کرتی کیونکہ ہاشمی خون میں یہ شعور رچ بس گیا ہے کہ اگر سر نیزوں پر سجتے ہیں تو نیزے بھی سروں سے ہی سجتے ہیں''۔

اس کے بعد ان کی نظم ''شہید کربلا'' پڑھی۔ شعر دیکھیے کہ:

زعم باطل خندہ زن تھا، جب حق و انصاف پر
جب چمکتے تھے سروں پر خنجر و تیغ و تبر
اے حسین! اس دور استبداد میں بھی تو مگر
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
بھول سکتا ہے زمانہ کیسے قربانی تری
ختم ہو سکتی نہیں اے شمع! تابانی تری

''گندم نما جو فروش'' میں انھوں نے ہمارے

مقتدر حلقوں کی منافقت اور اس مکر و فریب کو خوب اجاگر کیا۔ جو وہ احساس کے نام پر عوام سے روا رکھتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

میڈیا کے ، ہو کے کاندھوں پر سوار
کر رہے ہیں خود نمائی بار بار

روز اخباروں میں تصویریں چھپیں
خواہ جیسی بھی ہوں تحریریں چھپیں

خود کو جو ظاہر کریں اہل کمال
اور اندر سے ہو ابتر جن کا حال

اپنی اصلیت چھپا سکتے نہیں
چاہتے ہیں جو، وہ پا سکتے نہیں

خواہ پہنے شیر کی سو بار کھال
خر کا لیکن شیر بننا ہے محال

.....

حال ہی میں فلسطین اور غزہ کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک ہو رہا ہے۔ وہ انتہائی دردناک ہے۔ فلسطینیوں کے لیے ان کے اپنے گھروں میں رہنا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ وہ خیموں میں پناہ گزین ہیں مگر وہاں بھی محفوظ نہیں۔ ''اہل فلسطین'' کے عنوان سے نظم انہوں نے شاید برسوں پہلے لکھی تھی۔ مگر آج بھی حسب حال ہے۔

اس دور پرآشوب کے بے رحم فراعین
ہیں توڑ چکے آج شرافت کا ہر آئین

مسلم کے لیے ان کے دساتیر و فرامین
ہیں امن کی تذلیل، ہیں انصاف کی توہین

دامان غزہ، خون شہیداں سے ہے رنگین
ہے خاک بسر، زخم بپا اہل فلسطین

.....

ان تحریروں کے علاوہ کتاب میں دو خطوط بھی شامل کئے گئے ہیں۔ یہ خطوط فرزند علامہ اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال نے ان کے نام لکھے تھے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ان خطوط کا عکس بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کی شاعری سے بھی انتخاب دیا گیا ہے۔ ان میں حمد، نعت، غزلیں اور مختلف موضوعات پر لکھی شاعری بھی شامل ہے۔ اس حصے کے آخر میں پنجابی، فارسی اور سرائیکی کلام میں سے بھی کچھ انتخاب دیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت پر مختلف مشاہیر ادب کی مختصر مختصر آرا بھی شامل کی گئی ہے۔ ان میں ابوالاثر حفیظ جالندھری، احسان دانش، سید ابوالاعلیٰ مودودی، رئیس امروہوی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر سید عبداللہ، طفیل ہوشیار پوری، مرزا ادیب، ممتاز مفتی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا جیسی شخصیات شامل ہیں۔ ملاقات کے دوران گفتگو کرتے ہوئے قاسم جلال صاحب نے بتایا کہ وہ قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری سے بھی ملے تھے اور ان کا انٹرویو کیا تھا۔ ان کی اس بات کا حوالہ بیگم خورشید

حفیظ جالندھری کے ان تاثرات سے بھی ملتا ہے۔ جس میں وہ لکھتی ہیں۔

''ڈاکٹر سید قاسم جلال نے میرے سامنے ابوالاثر حفیظ جالندھری کا انٹرویو کیا تھا۔ حفیظ نے اپنے بارے میں زبانی طور پر جو کچھ قاسم جلال صاحب کو بتایا تھا، انہوں نے اسے کسی بناوٹ کے بغیر بڑی محنت و کاوش سے اپنی کتاب ''حفیظ جالندھری۔ کچھ یادیں، کچھ باتیں'' میں شائع کر دیا ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی اس دنیا میں حفیظ سے پیار کرنے والے کچھ لوگ موجود ہیں جن میں قاسم جلال سرفہرست ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان کے علم کو وسعت اور ترقی عطا فرمائے۔ میری خواہش ہے کہ حفیظ کے انٹرویو والی کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں وہ تصاویر بھی شامل کی جائیں جو حفیظ نے انٹرویو کے دوران میں میرے ساتھ کھنچوائی تھیں''۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کی 40 مطبوعہ کتابوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ ان کا کون سا مجموعہ کب شائع ہوا 1973 سے شروع ہونے والا سفر 2022 پر ختم ہو رہا ہے۔ لیکن یہ شائع ہونے والی کتابوں کا سفر ہے۔ ان کے لکھنے کا سفر تو اب بھی جاری ہے۔

ڈاکٹر سید قاسم جلال نصف صدی سے زائد عرصے سے قلم و کتاب سے جڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کی تمام اصناف پر لکھا۔ بطور افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، شاعر، محقق، نقاد، مبصر اور سوانح نویس انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چند ماہ ہی گزرتے ہیں کہ ان کی کوئی نہ کوئی کتاب ادبی افق پر نمودار ہو جاتی ہے۔ سعید صاحب (مدیر حقیقت) کے آفس میں کتابوں کے شیلف میں ان کی کئی کتابیں نظر آئیں۔ چند ماہ بعد نئی کتاب کا آجانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بہت زیادہ لکھنے والے ہیں اور ایک طرح سے علم و ادب کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔

سترہ کتابیں و جرائد ایسے ہیں، جن میں ان کی علمی و ادبی خدمات پر تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ مختلف ادبی جرائد نے ان پر خصوصی نمبرز بھی شائع کیے ہیں۔ ان میں ماہنامہ ''رشحات'' کا ضخیم نمبر انہوں نے مجھے بھی عطا کیا تھا۔ یہ شمارہ جولائی 2005 میں شائع کیا گیا۔ 320 صفحات پر مشتمل اس خصوصی شمارے میں ان کی زندگی کے ہر پہلو کا جائزہ لیا گیا۔ کچھ معروف شخصیات کے ساتھ نایاب تصاویر بھی اس شمارے کی زینت بنیں۔ اس کے علاوہ انہیں سولہ کے قریب ادبی اعزازات سے نوازا گیا۔ جن کی تفصیل کتاب میں تین صفحات پر موجود ہے۔ سب سے اہم کام، جو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کے ادبی کام پر مختلف جامعات سے 24 تحقیقی مقالہ جات لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ادبی خدمات پر ایم فل اردو کے پندرہ، ایم اے اردو کے تین اور بی ایس آنرز اردو، فارسی کے چار مقالہ جات شامل

ہیں۔ جبکہ پی ایچ ڈی کا مقالہ اس کتاب کے مرتب شفیق الرحمٰن الہ آبادی نے لکھا۔ جس کا موضوع تھا۔ ''اردو شاعری میں فکر اقبال کی توسیع، تحقیقی وتنقیدی جائزہ''۔ اس کا ذکر شفیق صاحب نے اپنے ابتدائیے میں بھی کیا ہے اور میرے خیال میں اس کتاب کا عنوان اور موضوع پر کام کی تحریک کی وجہ بھی یہی مقالہ ہوگا۔

کتاب کے بیک ٹائٹل پر علم وادب سے وابستہ کچھ معروف شخصیات کے مختصر مختصر تاثرات دیئے گئے ہیں۔ یہاں میں دو شخصیات قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری اور معروف محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کے تاثرات نقل کر رہا ہوں۔

''قاسم جلال کی شاعری میں ایک بصیرت یافتہ روح کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری نے اسلوب کی حسن کاری اور گہرے غور وفکر سے توانائی پائی ہے۔ (حفیظ جالندھری)

ڈاکٹر سید قاسم جلال اردو ادب کے استاد ہیں۔ شعروادب سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ انھوں نے بہت جلد ادب وتنقید کی دنیا میں اپنا مقام بنالیا ہے''۔ (ڈاکٹر جمیل جالبی)

دلچسپ بات یہ کہ ڈاکٹر سید قاسم جلال کی اس کتاب پر تاثرات میں نے تقریباً مکمل کر لیے تھے کہ ایک روز ڈاک خانے میں اپنے شاعر دوست عمران مدحر کے پاس بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا کہ ایک دم پوسٹ مین نے لفافہ میرے آگے کر دیا۔ میں حیران کہ یہ خط کہاں سے آ گیا۔ کیونکہ اب تو عرصہ ہو گیا، خط کتابت کرتے ہوئے۔ خط کو الٹ کر دیکھا تو پیچھے کمپوز شدہ ڈاکٹر سید قاسم جلال کا نام اور مکمل پتہ لکھا ہوا تھا۔ خط کھولا تو اس میں کاغذ کے ایک طرف انہوں نے میری کتاب ''شہاب فکر'' پر مختصر تبصرہ اور دوسری طرف خط تھا۔ جس میں رمضان المبارک اور عید کی مبارک باد دی گئی تھی۔ ذہن میں فوراً یہی آیا کہ انہوں نے عید کی مبارک باد دی ہے تو خط بھی عید سے پہلے لکھا ہوگا۔ مگر مجھے عید کی چھٹیاں گزرنے کے بعد تیسرے ورکنگ ڈے میں مل رہا تھا۔ انھوں نے مجھے دی گئی اپنی کسی کتاب پر مضمون کے لیے لکھا تھا۔ جبکہ میں ان کا یہ خط ملنے سے پہلے ہی مضمون تقریباً مکمل کر چکا تھا۔ خط ملنے کی خوشی ایسے ہی تھی جیسے کسی کو ایسی چیز مل جائے، جس کا رواج ختم ہو چکا ہو۔ اب ایسی نایاب چیز ملنے کی خوشی کیسے نہ ہوتی۔ فوراً یہی خیال آیا کہ اس دور میں خط کوئی بہت زیادہ پڑھنے اور لکھنے والا بندہ ہی لکھ سکتا ہے اور ڈاکٹر سید قاسم جلال اس معیار پہ پورا اترتے ہیں۔ ان کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ سادہ موبائل استعمال کرتے ہیں اور ان سے رابطے کے لیے بھی مخصوص وقت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا زیادہ وقت لکھنے، پڑھنے پر صرف کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

مصورانہ خطاطی کا دبستان.....اسلم کمال

اکیسویں صدی سائنس وٹیکنالوجی کی صدی ہے، لیکن کرۂ ارض پر زندگی سے وابستہ تمام ثقافتوں کو سمجھنے کے لیے آج بھی فنونِ لطیفہ نہ صرف ماضی بلکہ حال کی تمام دنیاوی ثقافتوں کو سمجھنے میں آسانیاں فراہم کر رہے ہیں۔ فنونِ لطیفہ اقوام کی تہذیب، ثقافت، معاشرت اور تمدن کو اُجاگر کرنے کا ایک اہم ذریعہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ زندہ قومیں فنونِ لطیفہ کے فروغ کی کوشش میں مصروفِ عمل رہتی ہیں۔ فنونِ لطیفہ احساسات کی اس نازک سطح کے اظہار کا نام ہے جہاں معمولی سی لغزش بھی سننے، دیکھنے اور سمجھنے والے کے احساسِ لطافت کو کثافت سے دوچار کر سکتی ہے، یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنونِ لطیفہ دراصل تخیل کو متشکل کرنے کا نازک عمل ہے اور زبان، لفظ، اشارے، حرکات وسکنات اور رنگ فرد کے اندر کے احساس کو بیدار کرنے اور اُسے باہر لانے کا ایک کارگر فعل ہے۔ خیال کو اظہار کا پیکر عطا کرنے کے لیے کبھی آنکھوں سے کام لیا جاتا ہے، تو کبھی ہونٹوں سے، کبھی اشاروں، کنایوں میں بات کی جاتی ہے، تو کبھی غزلوں میں، اسی کے ساتھ کبھی لکیروں سے کام لیا جاتا ہے تو کبھی نقوش اور رنگوں میں لپٹی کہانی بیان کرنے والا مصور اور خطاط کہلاتا ہے۔ اگر مصور اپنے فن میں کامل ہو، تو بات کو کچھ اس رخ سے بیان کرتا ہے کہ ہمہ تن گوش قاری تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کے لیے تڑپ اٹھتا ہے اور بے ساختہ اپنے لبوں سے بقول غالبؔ کے یوں صدا دینے لگتا ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

.....

جب بھی ایسے کامل مصوروں اور خطاطوں کا ذکر ہوگا تو اُن میں اسلم کمال کا تذکرہ بھی ضرور کیا جائیں گا۔ اسلم کمال کا شمار عالمی

صدام ساگر

شہرت یافتہ مصور و خطاط، افسانہ نگار، شاعر، سفرنامہ نگار کے طور پر ہوتا ہے۔ جو 23 جنوری 1939 کو ضلع سیالکوٹ کے موضع کور پور میں میاں محمد شفیع کے ہاں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اقبال میموریل ہائی سکول گوٹھ پور مراد پور سے حاصل کی، اس سکول کی خاص بات یہ تھی کہ یہ تعلیمی ادارہ شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کی یاد میں قائم ہُوا۔ بعدازاں ایف اے گورنمنٹ کالج کوہاٹ اور پھر بی اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے حاصل کی۔ اسلم کمال ایک خاموش طبع اور دھیمے مزاج کے انسان تھے، انھوں نے اپنی ساری زندگی مصورانہ خطاطی کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ان کے تخلیق کردہ فن پاروں میں مقدس الفاظ میں موجزن پیغام متاثر کن ہے۔

اسلم کمال محبت کرنے اور درد دل رکھنے والے انسان بھی تھے، لیکن وہ دنیا بھر میں ایک مصور اور خطاط کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، ان کی طرزِ تحریر کو بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ اردو ادب و ثقافت کو ایک نیا خوب صورت انداز دیا اور اس خطاطی اور اپنی منفرد مصوری سے کتابوں کے ہزاروں دیدہ زیب سرورق بنائے، جو پاکستان کا ہی نہیں عالمی ریکارڈ بھی ہوسکتا ہے، ان کے خطاطی کے مخصوص انداز کو ''خطِ کمال'' کہا جاتا ہے۔ وہ غالب، اقبال اور فیض کے کلام سے بے حد متاثر تھے اسی وجہ سے انھوں نے غالب، اقبال اور فیض کی شاعری کو اپنے تجزیاتی، فکری، روحانی مصوری اور خطاطی کی بدولت اُن کی شاعری اور تصویروں کو اپنے کمال فن سے دلکشی عطا کی۔ ان کے کام کی انفرادیت، جامعیت، شناخت اور سالمیت ہی ان کا اصل آرٹ تھا جو موجودہ عہد کے مصوروں اور خطاطوں میں اپنی منفرد پہچان رکھتا تھا۔ ان کے تخلیقی فن پاروں پر مبنی تصانیف میں ''اسلامی خطاطی ایک تعارف''، ''قلم موقلم''، ''ادیبوں اور شاعروں کے کیری کیچر''، ''نقوشِ کمال'' اور ''کسبِ کمال'' شامل ہیں۔

ادب اور فنونِ لطیفہ کی بڑی شخصیت اسلم کمال جو خود میں فن کی ایک نئی دنیا آباد رکھتے تھے، انھوں نے کئی دہائیوں تک اپنے فن سے ادب و ثقافت کی دنیا کو روشن کیا۔ اسلم کمال کے نام کو دوبار پاکستان کی طرف سے گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے لئے بھیجا گیا۔ پہلی بار ان کا نام اُس وقت بھیجا گیا جب انھوں نے اکادمی ادبیات اسلام آباد کے لیے پاکستان کی ادبی تاریخ پر کام کیا، جبکہ دوسری بار ان کا نام اردو سائنس بورڈ وزارت قومی ثقافتی ورثہ نے گراں قدر کام کرنے پر بھجوایا۔ ان کے 500 سے زائد

پاکستانی ادیبوں کے کیریکچر آج بھی اکادمی ادبیات پاکستان میں ادبی کہکشاں کے عنوان سے دیواروں پر سجے دکھائی دیتے ہیں۔ اس منفرد کام کرنے پر حکومت پاکستان نے انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس کے بڑے اعزاز سے بھی نوازا۔ ان کے اقبال کی شاعری کو مصور کرنے والے فن پاروں پر مشتمل آرٹ گیلریاں ایوانِ اقبال لاہور اور پنجاب یونیورسٹی اور دنیا بھر کے بہت سے تعلیمی اداروں میں قائم کی گئیں۔ جس پر انہیں متعدد تعلیمی اداروں سے کئی بار لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ بھی دیے گئے۔

اسلم کمال ایک ایسے فن کار تھے جو حقیقی طور پر کائنات کو تخیل کی آنکھ سے دیکھتے، مفکر کے ذہن سے سوچتے اور مصور کے قلم سے سمجھتے تھے۔ ان سے جڑی اپنی چند یادیں تازہ کرتے ہوئے جلیل عالی بتاتے ہیں کہ ”اسلم کمال سے میری پہلی ملاقات میرے اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اردو 1965 کے بزرگ کلاس فیلو بشیر منذر کے ایک روڈ پر واقع مینار آرٹ پریس پر ہوئی، ان دنوں وہ اپنی تخلیقی خطاطی اور مصوری کے ساتھ ساتھ روزگار کے لیے اس پریس کو شادی کارڈ ڈیزائن کر کے دیا کرتے تھے، شعر بھی کہتے تھے، یہ پریس ادیبوں کا تکیہ تھا، سہ پہر کے بعد حفیظ تائب اور دیگر احباب یہاں جمع ہو جاتے، چائے کے ساتھ گپ شپ اور شعر و شاعری بھی جاری رہتی، مزاجوں کے اشتراک کی بنا پر اسلم کمال سے تعارف جلد ہی گہرے مراسم میں تبدیل ہو گیا، ہماری دوستی تب سے اب تک کسی طرح کی بھی کمی نہیں آئی، اقبال اور فیض ہمارا مشترک عشق تھا۔ میرے تین شعری مجموعوں کے سرورق ان کی شفقت اور محبت کی یادگار نشانیاں ہیں۔ ہمارے درمیان گہری فکری و نظریاتی ہم آہنگی دوستی سے بھی کہیں آگے کی چیز تھی، حسنِ اتفاق دیکھیے کہ میری ملازمت کے آغاز میں بھی ان کی محبت کا بڑا ہاتھ تھا، سرسید کالج میں میری الوداعی تقریب کی صدارت انہوں نے فرمائی، ان کی رحلت میرے لیے ذاتی نقصان کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اس سے ہماری تخلیقی و تہذیبی زندگی کو بڑا دھچکا لگا ہے۔ مصورانہ خطاطی میں تو وہ اپنی ذات میں مکمل دبستان تھے۔“

اسلم کمال نے اپنے کام میں ہماری فکری تہذیبی روایت کی آفاقی روحانی جہات کو منعکس کر کے ادب و ثقافت کو ہمیشہ کے لیے چار چاند لگا دیئے۔ ان کی اختراعی صورت حروف کو ہر لحاظ سے ”خطِ کمال کے نام سے یاد رکھا جائے گا، اسلم کمال مصوری اور خطاطی کے علاوہ نہایت عمدہ سفرنامہ نگار

اور منفرد کالم نگار، افسانہ نویس بھی تھے۔ ان کا پہلا سفر نامہ ''اسلم کمال اوسلو میں'' کے نام سے چھپا، جبکہ دوسرا سفر نامہ ''گمشدہ'' جو لندن میں بیتے ہوئے خوبصورت اور یادگار لمحات کی روداد پر مبنی ہیں۔ اس سفر نامہ کو کراچی کے معروف اشاعتی ادارے ''رنگِ ادب'' نے شائع کیا۔ جبکہ دیگر تصانیف میں چین کا سفر نامہ، افسانے اور شاعری وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے ایک اور قریبی دوست اعتبار ساجد اس کالم کے دوران بتاتے ہیں کہ ''اسلم کمال نہایت خوش لباس تھے اور کسی زمانے میں ان کی جوانی کا بھرپور زمانہ تھا بہت پُرکشش انسان تھے، لیکن آہستہ آہستہ یہ کشش کی چمکتی ڈھلتی گئی، میرا ان سے تقریباً چالیس برس کا تعلق رہا جب وہ اقبال میوزیم میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور بعد میں کئی جگہ پر خدمات انجام دیتے لگے، لیکن جب بھی ملے بڑے بھائیوں کی طرح ملے، جو بھی گزارش کی انھوں نے نہ صرف خوش دلی سے پورا کیا بلکہ ہمیشہ یہی کہا کہ تم میرے چھوٹے بھائی ہو اور سچے شاعر ہو۔ انہوں نے میری کتابوں کے کئی ٹائٹل بنائے اور ''خطِ کمال'' میں میرے نام کے کئی ڈیزائن بھی تیار کیے۔ وہ نا صرف ایک باکمال مصور تھے بلکہ بہت ہی بے مثال خطیب بھی تھے۔''

اسلم کمال ادب و ثقافت کے ہر فن میں باکمال تھے، ان کے ساتھ میری پہلی ملاقات بڑے بھائی اعتبار ساجد کے شعری مجموعے ''امتزاج'' کی تقریب میں الحمرا ہال ادبی بیٹھک میں ہوئی، جس کے بعد لاہور کی بہت سی تقریبات میں ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، وہ بہت عمدہ گفتگو کے ساتھ ساتھ بہت اچھے اشعار بھی کہتے تھے۔ نئے سال کا آغاز ہوتے ہی 2 جنوری کی صبح اب باکمال ادب وثقافت کے آفتاب کی روشنی سے محروم ہو گئے، ہماری جمالیاتی زندگی میں ان کی عدم موجودگی کا خلا تا دیر تک محسوس کیا جاتا رہے گا، مصورانہ خطاطی کے دبستان اسلم کمال کے بنائے ہوئے فن پارے ادبی رسائل و کتب کی صورت میں ہمیشہ ان کے ہونے کی یاد دلاتے رہیں گے، اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آخر میں ان کے بچھڑ جانے کے غم میں افسردہ دل کے ساتھ سعد اللہ شاہ کا ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

افسردہ ہم کو کر گیا آغاز سال بھی
یعنی کہ دیکھنا پڑا فن کا وصال بھی

فن کار ایسے ملتے نہیں خال خال بھی
رخصت ہوئے ہیں لیجئے اسلم کمال بھی

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلک کمیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے گی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

بہاولپور، ڈی سی کے شب و روز: جو ریاستیں پاکستان کے حصے میں آئیں ان میں بہاولپور سب سے امیر ریاست تھی۔ کسی زمانے میں یہ سندھ کا حصہ بھی رہی ہے۔ عرب کے عباسیوں کی یہاں آمد اور بتدریج اقتدار پر قبضے کی داستان خاصی دلچسپ ہے۔ خاندان عباسی نے ایک طویل عرصہ تک حکمرانی کی۔ معتصم باللہ کی ہلاکو خان سے شکست کے بعد ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ اموی حکمران عبدالرحمٰن اوّل کی طرح جو شکست کے بعد ہسپانیہ دوڑ گیا تھا اور وہاں بادشاہت قائم کر لی تھی۔ انہوں نے بھی مصر کو حکمرانی کے لئے موزوں پایا۔ ان میں ابوجعفر منصور جیسے سفاک چالاک لیکن

کامیاب ظالم حکمران گزرے ہیں۔ ہارون رشید جیسے وسعت نظر رکھنے والے بلند حوصلہ، مامون جیسے علم دوست اور معتصم باللہ جیسے نااہل بھی شامل ہیں۔ ان کے جدامجد حضرت عباس رسول اکرم کے چچا تھے۔ ہارون رشید اُن کی چھٹی پشت سے تھا۔ خلفائے راشدین کے بعد اموی خاندان نے ایک طویل عرصہ تک حکمرانی کی۔ بادشاہوں کی نا اہلی، محلاتی سازشوں، تعیش اور اخلاقی گراوٹ بالآخر ان کے زوال کا سبب بنی۔

عباسی خاندان کے پہلے حکمران عبداللہ بن سفاح کے چچا عبداللہ ابن علی نے آخری اموی حکمران مروان ثانی کو دریائے زب کی شاخ کے قریب شکست دی۔ مروان مارا گیا۔ جب خاندان کے افراد کا تعاقب شروع ہوا تو انہیں جان بچانی مشکل ہوگئی۔ بالآخر عبداللہ ابن علی نے صلح کا ڈھونگ رچایا۔ سو کے لگ بھگ اموی شہزادوں کو کھانے پر بلایا۔ جب کھانا شروع ہوا تو کمین گاہوں میں چھپے ہوئے سپاہیوں نے حملہ کر کے ان سب کو مار دیا۔ ہر طرف خون کے لوتھڑے اُڑنے لگے لیکن ضیافت پھر بھی جاری رہی۔ عبداللہ نے مردہ اور قریب المرگ زخمی، کراہتے سسکتے اور بلکتے ہوئے شہزادوں پر چمڑے کی ایک چادر بچھا دی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان مردہ لاشوں پر بیٹھ کر کھانا نوش فرمایا۔

دراصل تین شخصیتیں ایسی تھیں جنہوں نے امویوں کو شکست دی۔ عبداللہ ابن علی، ابومسلم خراسانی اور امام نفس ذکریا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ ابومسلم خراسانی اتنا طاقت ور جرنیل تھا کہ چاہتا تو اپنی چھٹکی اُٹھا کر خاندان بنوعباس کو اس طرح نکال باہر کر سکتا تھا جس طرح وہ انہیں لایا تھا۔ وہ بھی امویوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ نفس ذکریا کا تعلق خاندان بنو ہاشم سے تھا۔ ان کے ہاتھ پر حمیمہ کے قصبے میں عباسیوں نے بیعت کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ امویوں سے چھٹکارا ملتے ہی وہ اقتدار ان کو سونپ دیں گے۔

لیکن اقتدار کی اپنی منطق ہوتی ہے اور یہ اپنے راستے خود متعین کرتا ہے۔ اس میں نرم دلی، اخلاقیات، ایفائے عہد کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جب ابوجعفر منصور حکمران بنا تو اسے سب سے زیادہ خطرہ ان تینوں سے محسوس ہوا۔ جنگ وہ جیت نہیں سکتا تھا لہٰذا چالاکی اور مکاری سے کام لیا۔ ابومسلم خراسانی کو دعوت دے کر بلایا، بڑی آؤ بھگت کی۔ اس کے استقبال کے لئے خود شہر سے باہر گیا اور اسی رات اپنی موجودگی میں اُسے قتل کروا دیا۔ چچا عبداللہ بھی نہ بچ سکا۔ اس کو گرفتار کر کے پہلے تو محل میں رکھا پھر اس کے لئے بڑا خوبصورت محل تعمیر کرایا۔ البتہ اس بات کا خیال رکھا گیا کہ محل کی بنیادیں نمک پر اُٹھی ہوں۔ پہلی بارش سے ہی محل زمین بوس ہو گیا اور چچا جان منوں مٹی کے ملبے تلے دب گئے۔ نفس ذکریا اس کے جھانسے میں نہ آیا تو جنگ کر کے انہیں بھی شہید کر دیا۔

ہارون کا عہد بلاشبہ مسلمانوں کے عروج کا

زمانہ تھا۔ وہ بیدار مغز، بلند حوصلہ، دُور اندیش اور زیرک حکمران تھا۔ وہ اس وقت تمام دنیا کا طاقت ور ترین حکمران سمجھا جاتا تھا۔ یورپ کا کوئی حکمران اتنا بااثر اور مشہور نہیں تھا۔ اس کا دربار منفرد تھا۔ محل میں ستر ہزار زربفت کے پردے، دربار میں چار ہزار حبشی نیزہ بردار غلام، تین سو شیر ببر، شارلیمان کے سفیر آئے تو کوتوال کے چیمبر کو بادشاہ کا دربار سمجھ کر بیٹھ گئے۔ ذرا اور آگے چلیں اُنہیں بتایا گیا۔ وزیراعظم کے کمرے میں جا کر پھر بیٹھ گئے۔ آخر جب ہارون کے دربار میں پہنچے تو اس کی سج دھج اور طمطراق دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگے۔ ہارون نے شارلیمان کو گھڑی بھجوائی تو شاہ فرانس کے درباری اُسے جادو کا آلہ سمجھ بیٹھے اور انہوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ اسے فوراً پانی میں پھینک دیا جائے۔

ان دنوں قسطنطنیہ عربوں کو خراج دیتا تھا۔ اس کی ملکہ کا نام ایرینی تھا جو عورت ہونے کے باوصف پاگل پن کی حد تک ظالم تھی۔ آخر جرنیل تنگ آ گئے اور انہوں نے اسے معزول کر دیا۔ ایک جنرل نائیس فورس جس کو عرب مورخین نے نکفر بھی لکھا ہے روم کا حکمران بن گیا۔ اس نے ہارون کو ایک چتک آمیز خط لکھا۔ نائیس فورس شہنشاہ روم کی طرف سے۔ عرب بادشاہ ہارون رشید کی جانب ''تم نے ایک عورت کی نسوانی کمزوریوں کا ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے لیکن وہ دن لد گئے ہیں۔ کیا تمہیں علم ہے کہ اب روم پر ایک جرنیل کی حکمرانی ہے۔ تم نے آج تک جتنا خراج بٹورا ہے سب بلاچون و چرا واپس کرو اور آئندہ ہمیں خراج دینے کا وعدہ کرو، وگرنہ تمہارے اور ہمارے درمیان تلوار منصف ہوگی۔''

ہارون ایسی تحریریں پڑھنے کا کہاں عادی تھا۔ غصے سے تھر تھر کانپنے لگا۔ خط ہاتھ سے گر پڑا، تمام درباری مہر بلب دربار سے کھسک گئے، عتاب شاہی کسی پر بھی گر سکتا تھا۔

حکم ہوا، جواب تیار کرو۔ منشی منقوں نے ضخیم دستاویز لکھ ڈالی جس میں ہارون کی نجابت کا ذکر بطور خاص کیا گیا تھا۔ تحریر کیا تھی بادشاہ کی قصیدہ خوانی کی گئی تھی۔ ہارون نے پڑھ کر اُسے پھاڑ دیا اور پلندے کو ردی کی ٹوکری میں ڈلوا دیا۔ نکفر کے خط کی پشت پر اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ''امیر المومنین ہارون رشید کی طرف سے۔ روم کے کتے نائیس فورس کی جانب۔ جو کچھ ہونے والا ہے وہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا، کانوں سے نہیں سنے گا۔'' ایک لشکر جرار لے کر وہاں پہنچا اور اسے شکست فاش دی۔ خراج لے کر واپس لوٹا تو پتہ چلا کہ نکفر نے ایک بار پھر بغاوت کر دی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ برف باری کی وجہ سے ہارون فوراً واپس نہیں آئے گا۔ ہارون انہی قدموں سے واپس لوٹا ایک بار پھر شکست دے کر معزول کر دیا۔

الف لیلیٰ میں ہارون کے بغداد کا ذکر ہے جہاں ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات ہوا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ شکار پر

گیا۔ ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑاتا بہت دور نکل گیا۔ تمازت آفتاب سے پیاس لگی تو چھاگل میں پانی ختم ہو چکا تھا، حلق سوکھ گیا، زبان منہ سے نکل آئی۔ بڑی مشکل سے مصاحبین کہیں سے پانی کا گلاس ڈھونڈ کر لائے۔ جب پینے لگا تو مشیر نے کہا ''عالم پناہ ایک منٹ رکیے۔ اگر آپ کو اس وقت اس جرعہ آب کی قیمت دینی پڑے تو کیا دیں گے؟''

''آدھی سلطنت'' ہارون نے بلا توقف جواب دیا۔ جب وہ پانی ڈیک لگا کر پی گیا تو مشیر نے پھر پوچھا ''بالفرض یہ پانی آپ کے جسم سے خارج نہ ہو سکے تو اخراج کے لئے کیا دیں گے۔''

''بقیہ آدھا حصہ''۔

''پھر سوچ لیں'' مشیر بولا ''جس سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی ہو اُس کے لئے اس قدر تگ ودو اور مارا ماری کا کیا فائدہ ہے؟''

ہارون پر رقت طاری ہو گئی۔

اس قدر شاندار طرز حکومت میں دو واقعات ایسے ہیں جنہوں نے اس کی شہرت کو داغدار کیا۔ امام جعفر صادق کو پابہ جولاں زندان میں رکھنا اور برامکیوں کا قتل۔ ہارون نے ۷۸۳ء میں پیدل حج کیا۔ حج کے دوران اس نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ عرب بدو اسے خلیفہ جان کر سلام کرتے۔ اس نے دُور کھڑے ہوئے ایک شخص کو دیکھا کہ وہی لوگ اس شخص کے ہاتھ چومتے ہیں، فرط عقیدت سے انہیں آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ ہارون اس شخص کے پاس چلا گیا۔ بولا ''کیا بات ہے کہ یہ مجھ سے زیادہ تمہارا احترام کرتے ہیں۔''

وہ شخص بولا ''وجہ صاف ظاہر ہے۔ تو ان کے جسموں پر راج کرتا ہے۔ میں ان کے دلوں پر حکمرانی کرتا ہوں۔''

''پھر ایک حکومت میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔'' ہارون تلملایا اور انہیں قید کر لیا۔

وہ امام جعفر صادق تھے۔ برامکہ بہت پڑھے لکھے اور ہارون کے وفادار تھے۔ اس کے ایام حکومت کو ''سنہری دور'' بنانے میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ بادشاہ کانوں کے کچے ہوتے ہیں، وہ مخالفین کے بھڑکانے پر طیش میں آ گیا اور برسوں کے تعلقات کو نظر انداز کر کے اپنے رضائی بھائی جعفر برمکی کو مروا دیا اور اپنے اتالیق خالد برمکی کو زنداں میں ڈال دیا۔

عباسیوں کا عروج وزوال حیرت ناک اور عبرت انگیز تھا۔ ۸۱۲ء میں خلیفہ دنیا کا طاقت ور ترین حکمران تھا۔ سو سال بعد اس کے جانشین اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ دارالحکومت تک میں ان کا موثر کنٹرول نہ تھا۔ ۱۲۱۵ء میں ہلاکو خان کے ہاتھوں دارالحکومت ہی تباہ ہو گیا۔ اس وقت معتصم باللہ حکمران تھا۔ ہلاکو کو بتایا گیا کہ اگر خلیفہ قتل ہو گیا تو غم سے سورج اپنا چہرہ چھپا لے گا۔ چار سو تاریکی پھیل جائے گی، ہوائیں رُخ بدل لیں گی۔ دریا کا پانی ساکت وجامد ہو جائے گا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ جانتا تھا کہ نظام شمسی کیا ہے، کیسے دن اور رات ہوتے ہیں۔ ازراہ تفنن اس نے خلیفہ کو قتل نہ کیا قالین میں لپیٹ کر لاتوں سے

مروا دیا۔ اس کے بعد بغداد میں جو کچھ ہوا اس کو گبن Gibbon کا ماہر قلم ہی رقم کر سکتا تھا۔ وہ لکھتا ہے "جب منگول بھیڑیے شہر میں داخل ہوئے تو قتل عام شروع ہو گیا۔ خون بارش کے پانی کی طرح گلیوں میں بہنے لگا۔ خون آلود لوتھڑے چار سو بکھرنے لگے۔ سراسیمگی کے عالم میں عورتیں اور ننھے بچے قران ہاتھوں میں لئے باہر نکل آئے اور رحم کی بھیک مانگنے لگے۔ ان وحشیوں نے ننھے بچوں کو نوک نیزہ پر دھر لیا۔ وہ عزت مآب عورتیں جنہوں نے کبھی ہجوم کی جھلک تک نہ دیکھی تھی، سر عام برہنہ ہو کے رُسوا ہوئیں۔ وہ علمی اور ادبی خزانے جنہیں مسلمان خلفاء نے صدیوں کی محنت سے جمع کیا تھا صرف چند گھنٹوں میں جلا دئے گئے۔ تین دن تک خاک اور خون کی بارشیں ہوتی رہیں۔ دجلہ سرخ ہو گیا اور مچھلیوں کی جگہ کٹے ہوئے انسانی اعضا موجوں کے زیر و بم کے ساتھ ڈوبتے اُبھرتے رہے۔ اس کے بعد بھی چھ ہفتوں تک رقص ابلیس جاری رہا۔ کھیت کھلیان، بستیاں اور مکان، مساجد اور مزار کچھ بھی تو باقی نہ بچا۔ محلات مسمار کر دئے گئے۔ بیماروں کو ہسپتالوں میں چن چن کر مارا گیا۔ تعلیمی درسگاہوں کے اساتذہ کی داڑھیاں نوچ کر جڑ سے اکھاڑ دی گئیں حتیٰ کہ مردے بھی ان کے عتاب سے نہ بچ سکے۔ ہڈیوں اور پنجروں کو قبروں سے نکال کر ان پر کوڑے برسائے گئے۔ کتابوں کو نذر آتش کیا گیا جو بچ گئیں ان کو دریا برد کر دیا گیا۔ اس طرح پانچ سو سال کی محنت شاقہ، عرق ریزی، تجسس و تحقیق تہس نہس کر دیے گئے اور قومی زندگی کا گلاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مرجھا گیا۔ کس قدر بے سروسامانی تھی، کوئی ویرانی سی ویرانی تھی۔ خلیفہ معتصم بید مجنوں کی شاخ کی طرح لرزتا ہوا اور رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدہ تر سے۔ خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔ بچے کھچے شہزادوں کا جدھر منہ سمایا دوڑ پڑے۔ آخری عباسی شہزادے ابوالقاسم بن ابونصر نے مصر میں جا کر پناہ لی۔ وہ خود تو مارا گیا لیکن پندرہ پشتوں تک حکومت چلتی رہی۔ ہندوستان کے حکمران محمد تغلق کو اس خاندان سے گہری عقیدت تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً مصر میں ان کے لئے تحفے بھجواتا رہا چنانچہ عباسیوں نے جوق در جوق ہندوستان آنا شروع کر دیا۔ اس نے ان کی بڑی عزت افزائی کی اور بڑی جاگیریں دیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے سندھ تک اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے افراتفری دیکھ کر سندھ پر اپنا تسلط جما لیا۔ اس وقت بہاولپور سندھ کا حصہ تھا۔ بالائی سندھ کا علاقہ دریائے ستلج کے مشرقی کنارے تک پھیلا ہوا تھا۔

امیر سلطان احمد دوم ابوالقاسم خلیفہ مصر کی پانچویں پشت سے تھا۔ وہ ۱۳۶۶ میں بلوچستان کے راستے سندھ میں پہنچا۔ کوٹ کانجی کے حاکم رائے دھورنگ سنہیہ نے اس کا استقبال کیا۔ ابتدائی شکوک و شبہات دور ہونے پر رائے نے اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا۔ امیر ابن ان کا بیٹا تھا۔ اس کا بیٹا ہرخان تھا۔ بہاول خان ہرخان کے پڑپوتے تھے۔ بہاول خان کا فرزند

امیر چنی خان تھا۔ جب شاہ جہاں کے بیٹے مراد خان گورنر ملتان نے دربار لگایا تو امیر چنی کو بھی مدعو کیا گیا۔ وہ حسب حیثیت تحفے تحائف لے کر گیا۔ مخالفین نے چنی کو ناکوں چنے چبوانے کا ایک نادر طریقہ سوچا۔ اس کے ملازمین کو کچھ دے دلا کر تحائف بدل دیے۔ جب بھرے دربار میں بند پیکٹ کھلے گئے تو حیرت سے امیر چنی کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ وہ لایا کچھ تھا اور نکلا کیا! کنکر اور ریت! اس کا دل گھڑی کے پنڈولم کی طرح اس کی پسلیوں سے جا ٹکرایا۔ خنجر بکف ملک الموت اسے اپنی شہ رگ کے قریب کھڑا محسوس ہوا۔ مراد خان نے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لئے محض چشم ابرو کا اشارہ کرنا تھا اور کاتب تقدیر کا آزاد قلم چل جانا تھا۔ میاں چنی خان کی حاضر دماغی کام آ گئی۔ اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے بولا ”قبلہ عالم! تحفے تو ہر شخص لاتا ہے لیکن میں محض تحفہ نہیں لایا آپ کی نجات کا پروانہ ساتھ لے کر آیا ہوں۔ روز قیامت آپ کا سر فخر سے بلند ہوگا۔ ان کنکروں کو محض سنگریزے نہ سمجھیں۔ یہ وہی خوش بخت ہیں جنہوں نے ابوجہل کے ہاتھ میں جا کر رسالت کی گواہی دی تھی۔ پتھروں میں قوت گویائی آ گئی تھی۔ باقی رہی ریت تو یہ کربلائے معلّٰی اور نجف اشرف سے آئی ہے۔ خون رگ رسولؐ اس مٹی کو اکسیر بنا گیا تھا۔ یہ بوترابیوں کی شان ہے۔ بوتراب تو نہیں بنا جا سکتا کیونکہ عالم میں ایک شخص ہی منتخب ہوا تھا لیکن اس کے قدموں کی دھول بھی گنہگاروں کی نجات کا عنوان بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نسل در نسل ہم نے اس کو حرز جاں بنا کر رکھا ہے اور اس انمول خزانے کی حفاظت کی ہے۔

سادگی اور عقیدت میں بال برابر فرق ہوتا ہے۔ شہزادے کا چہرہ فرط جذبات سے تمتما اٹھا۔ آنکھیں برسات کی رُت پیش کرنے لگیں۔ اُس نے احترام سے تبرکات کو اُٹھایا اور پیار سے چنی خان کو گلے لگا لیا۔ ایک فرمان کی رو سے سندھ کے سب سرداروں کو اس کے ماتحت کر دیا۔ اوباڑو سے لے کر بندر تک مالیہ کی وصولی بھی اس کے کھاتے میں ڈال دی۔ اس کے علاوہ بہت بڑی جاگیر بھی عطا فرمائی۔ خان کے وارے نیارے ہو گئے۔ اس ایک حاضر دماغی نے اسے چنی خان سے پھنے خان بنا دیا۔ گورنر کا نفس ناطقہ۔ یہی وجہ تھی کہ آروڑے کے حاکم ڈاہر پلال نے اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی۔ اس طرح سندھ میں عباسی خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ اُس نے اپنے بیٹے داؤد خان کی بجائے امیر مہدی کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ بیٹے کو زہد و تقویٰ پر لگا دیا۔ اُس دونوں کی نسل کلہوڑہ اور داؤد پوترا کہلائیں اور عباسیوں اور امویوں کی طرح ایک دوسرے کی خون کی پیاسی رہیں۔

خاندانی سلسلہ چلتے چلتے جب بہاول خان چہارم کے بیٹے نواب صادق محمد خان چہارم تک پہنچا تو تعمیر و ترقی کا آغاز ہوا۔ بہاول خان چہارم نے سات سال تک حکومت کی۔ اسے زہر دے کر مروا دیا گیا۔ مسلسل محلاتی سازشوں کی وجہ سے اکثر اوقات آسٹریلیا کے ایب اور جینز کی طرح طبعی

موت کو بھی قتل عمد سمجھا جاتا ہے۔ ان دنوں کون سے Forensic Science Laboratories ہوتی تھیں۔ البتہ افواہیں روشنی کی رفتار سے پھیلتی تھیں۔

صادق چہارم کو بہاولپور کا شاہ جہان بھی کہتے ہیں۔ سب محلات، باغات اور اہم عمارتوں کی تعمیر اس کے دور میں شروع ہوئی۔ سب عمارتوں کی چھتیں گولائی لئے ہوئے تھیں۔ کیونکہ گنبد و محراب اسلامی طرز تعمیر کا طرۂ امتیاز تھا۔ ۱۸۷۵ء میں نور محل بنوایا۔ محل کے قریب ایک خوبصورت فوارہ لگوایا۔ فوارے کے چاروں طرف کانسی کے بنے ہوئے بت تھے۔ غالباً یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ پریاں محل کے اندر ہی نہیں باہر بھی ہیں۔ پھر دربار محل اور گلزار محل تعمیر کرائے۔ جنہیں بنے ہوئے سو سال سے اُوپر ہو گئے ہیں۔ صادق گڑھ پیلس کی بنیاد بھی اُسی نے رکھی۔ اس کی تعمیر ۱۸۸۷ء میں شروع ہوئی۔ یہ محل دیگر محلات کی نسبت بہتر تھا کیونکہ بالآخر عباسیوں نے اس کو ہی اپنی سرکاری رہائش گاہ بنالیا۔ میوزیم ریلوے اسٹیشن، کالج، چڑیا گھر کا سنگ بنیاد بھی اسی حکمران نے رکھا۔ ریوے اسٹیشن ۱۸۷۵ء میں بنا۔ صادق گڑھ محل کی تعمیر سے قبل نوابان ڈیرہ مبارک میں رہتے جواب ڈیرہ نواب کے نام سے مشہور ہے۔

بہاول خان پنجم ۱۹۰۶ء میں حج پر گیا اور سرزمین حجاز میں ہی موت کو گلے لگا لیا۔ نواب سر صادق محمد خان پنجم آخری حکمران تھا۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۶ء کو فوت ہوا۔

نواب صادق پنجم مخیر شخص تھا۔ وہ غالباً واحد ریاستی حکمران تھا جس نے ریاست کا پاکستان سے الحاق خوش دلی سے کیا۔ یہ معمولی بات نہ تھی۔ وہ جب بھی حج پر جاتا اپنے ساتھ بحری جہاز میں پورا ساز و سامان لے کر جاتا۔ بے شمار غریب لوگوں کو بھی حج کراتا۔ ایک مرتبہ وہ حج پر گیا تو سعودی حکمران شاہ عبدالعزیز ملنے آیا۔ اس وقت سعودی حکومت کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس نے نواب صاحب کی رولز رائس دیکھی تو ملاقات پر مانگ لی۔ کہنے لگا ''میرے پاس کوئی ڈھب کی گاڑی نہیں ہے، یہ مجھے دے دیں۔'' نواب صاحب نے اپنے مخصوص سرائیکی لہجے میں، جن میں مٹھاس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ مترجم سے پوچھا ''کیا کہتا ہے؟''

''گاڑی مانگتا ہے'' اس نے بتایا۔ نواب صاحب مسکرائے اور واپسی پر سب گاڑیاں، خیمے، روزن تھال کی کراکری اور دیگر ساز و سامان اُسے دے آئے۔ آج شاہ عبدالعزیز اور صادق پنجم زندہ نہیں ہیں لیکن حالات نے پلٹا کھایا ہے۔ ابن سعود کے خاندان کے پاس جہازوں کا پورا بیڑہ ہے۔ جمبو، ایئر بس ڈی سی ۱۰، سی ۱۳۰، ہیلی کاپٹر وغیرہ۔ صادق پنجم کا پوتا صلاح الدین عباسی سوزوکی کار میں سفر کرتا ہے۔ معترضین کہتے ہیں کہ اس میں تنگ دستی نہیں بلکہ کنجوسی زیادہ کارفرما ہے۔ بہرحال اگر صلاح الدین چاہے تو ریاض جا کر اس تاریخی جملے کو دہرا سکتا ہے۔ سعودی حکمران اسے کبھی مایوس نہیں کریں گے۔

بہاولپور کی تاریخ جتنی دلچسپ ہے اس کا جغرافیہ بھی اس قدر وسیع ہے۔ یہ بھی رحیم یار خان کی طرح ان اضلاع میں شامل ہے جن میں کتر بیونت نہیں ہوئی۔ بہاولپور ضلع کی چار تحصیلیں ہیں۔ مشرق میں حاصل پور اور خیر پور ٹامیوالی میں جنوب میں احمد پور شرقیہ ہے۔ چوتھی بہاولپور ہے۔ دریائے ستلج ضلع کو سلام کرتا ہوا گزرتا ہے ملتان اور اس کے درمیان حد فاصل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب دریا نہیں بہتا صرف تہمت باقی رہ گئی ہے۔ سندھ طاس معاہدہ کی رُو سے اس کا پانی ہندوستان کے حصے میں آیا ہے۔ معاہدہ نہ بھی ہوتا تو ہندوستان کا اس کے پانیوں سے دستبردار ہونا مشکل تھا۔ یہ دریا اس کی ریگستانی ریاستوں بیکانیر اور جیسلمیر کو سیراب کرتا ہے۔ وہاں کی ریت پانی کی بدولت سونا اُگل رہی ہے اور یہاں کے چولستانی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سارا سال آسمان کو دیکھتے رہتے ہیں، سو نہیں سکتے۔ بین الاقوامی قوانین کے تحت دریا پر Source کا نہیں بلکہ Course کا حق ہوتا ہے لیکن ایک جنگل کا قانون بھی ہے۔ Survivel of the Fittest جس کی لاٹھی اس کی بھینس، بھارت کی لاٹھی کو کئی بیرونی طاقتیں مضبوط کرنے میں دن رات کوشاں ہیں۔ مغرب اسلام سے خائف ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ یہ درست ہے کہ اس قلعے میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئی ہیں لیکن یہ دشمن نے نہیں ڈالیں ہم نے خود ہی اپنی یہ حالت کر دی ہے۔

چولستان ایک وسیع و عریض صحرا ہے۔ جو سابق ریاست بہاولپور سے لے کر ہندوستان کی ریاست بیکانیر جیسلمیر اور سندھ تک پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان میں یہ صحرائے راجپوتانہ کہلاتا تھا۔ سندھ میں پہنچ کر تھر کے نام سے موسوم ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کون سا عہد تھا جب دریائے ہاکڑا اس کی پیاس بجھاتا تھا کیونکہ آج کل تو موائے العطش العطش کے اور کچھ سنائی نہیں دیتا۔ ہندوستان نے نہروں کا جال بچھا کر ہر دو ریاستوں کی دھرتی کو گلزار بنا دیا ہے۔ جہاں کسی زمانے میں بادصرصر اور باد سموم چلتی تھی وہاں اب گندم اور کپاس کے کھیت لہلہاتے ہیں اور پھلوں کے پیڑ سرسراتے ہیں۔ ہم بوجوہ ایسا نہیں کر پائے۔ جو قوم کالا باغ ڈیم بنانے پر متفق نہ ہو سکے اس کے متعلق دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ اجتماعی خودکشی کا اس سے آسان طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔ جب پنجاب تقسیم ہوا تو ۱۹ اضلاع پاکستان کے حصے میں آئے۔ ۱۱ ہندوستان کو ملے۔ وہ گیارہ اضلاع Grainry of India کہلاتے ہیں۔ ہم نے ۱۹ کے حصے بخرے کر کے ۳۴ بنا ڈالے ہیں لیکن پیداوار نہیں بڑھا سکے۔

چولستان کی وسعتوں میں ایک پر ہیبت شکوہ ہے ایک عجیب قسم کی دلآویزی اور رعنائی ہے۔ موسم سرما میں چاندنی راتوں میں صحرا بولتا ہے، گیت گاتا ہے، ہوائیں ایک

سندیسہ دیتی ہیں۔ اس بات پر تو عرب شہزادے مرمٹے ہیں۔ رات کو محل میں نہیں ٹھہرتے، صحرا میں شب باشی کرتے ہیں اور چولستانی موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آلات موسیقی میں چمٹا، چنگ، طنبورہ، یکتارہ استعمال ہوتے ہیں۔ دختر دہقاں کے گیت کا ذکر علامہ نے کیا تھا۔ انگریزی نظم Solitery reaper نے بھی دلوں کو برمایا ہے لیکن جو درد، سوز اور مٹھاس دختر صحرا کے گیت میں ہے وہ اور کہیں نہیں ملتی۔ جب وہ لہک لہک کر خواجہ فرید کا کلام پڑھتی ہیں تو ایک وجد کا سماں طاری ہو جاتا ہے۔

بن یار فرید نہ جیواں میں
کیوں اے جئی اوکھی تھیواں میں
سو زہر دا پیالہ پیواں میں
مجھٹ پوساں سولیں، سیواں میں

.....

''اے محبوب! تیری جدائی میں لمحات گزارنا مشکل ہے۔ زندگی روگ بن گئی ہے۔ ایک ہی ساغر زہراب مجھے کافی ہے جو سب درد و الم اور رنج و محن سے نجات دلا دے گا۔''

جس صحرا میں پانی نہیں ملتا وہاں ہسپتال کہاں ہوں گے۔ قدرت نے اپنا شفاخانہ کھول رکھا ہے۔ اکثر علاج جڑی بوٹیوں سے کیا جاتا ہے۔ کترن بوٹی دمہ کے لئے اکسیر ہے۔ برم ڈنڈی جگر کی گرمی دور کرتی ہے۔ چھپری بوٹی گنٹھیا ختم کرتی ہے۔ پھٹکڑ بوٹی سے پیشاب کی جلن دور ہوتی ہے، جنڈ بوٹی آشوب چشم کے لئے اکسیر ہے۔ لاونی اور گندی بوٹی سردرد اور نزلہ زکام کے لئے تیر بہدف ہیں۔

توہمات صحراؤں کو بھی نہیں بخشتے۔ بندہ صحرا بھی لکیر کا فقیر اور ان کا اسیر ہے۔ مہینے کی ۳، ۸، ۱۳، ۲۳ اور ۲۸ تاریخیں منحوس تصور کی جاتی ہیں۔ چاند کی ۱، ۷، ۹، ۱۰، ۲۱ کو چور چوری نہیں کرتے۔ باقی تاریخوں کو ویسے ہی کچھ نہیں ملتا۔ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا۔ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ ریاست کے دو تہائی حصے پر مفلسی، مایوسی اور عسرت کا راج ہے۔ ۱۶۶،۵۵۳۶۰ ایکڑ پر محیط اس علاقے میں ایک ہزار کنوئیں ہیں۔ اکثر کا پانی کڑوا ہے۔ صرف چولستانی ہی پی سکتے ہیں۔ کوئی نووارد پی لے تو فوراً بستر سے لگ جائے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ اسے چولستان کیوں کہا جاتا ہے۔ مختلف روایات ہیں۔ ہر کسی نے اپنی سوچ اور سوجھ بوجھ کے مطابق وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ ترکی لفظ چولی سے نکلا ہے جس کے معانی ریگستان کے ہیں۔ عراق میں ریگستان کو چیلستان کہا جاتا ہے، ہوسکتا ہے یہ اس کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔ آخری وجہ خاصی دلچسپ ہے۔ بہاولپور کے مشرق میں صحرائے راجپوتانہ ہے اور جنوب مغرب میں تھر ہے۔ یہ درمیان میں ہے اس لئے وچولو کہلایا۔ وچولو رفتہ رفتہ ترقی کر کے چولستان بن گیا۔

[جاری ہے۔]

غزل

چند رفیقِ مطمئن ، چند حریف دنگ بھی
ایک فریبِ صلح بھی ، ایک فریب جنگ بھی

عکس بہ عکس آذری ، سطر بہ سطر ساحری
ایک طلسمِ لفظ بھی ، اک طلسمِ رنگ بھی

ہم سے قیامتیں چلیں ، ہم سے ملامتیں چلیں
ہم ہی غبارِ بے نشاں ، ہم ہی شکارِ سنگ بھی

تیرگیاں پلٹ گئیں ، روشنیاں سمٹ گئیں
روپ کی دھوپ میں کھلے ، رات کے رنگ ڈھنگ بھی

وحشتِ عشق بھی وہی ، دہشتِ عشق بھی وہی
تجھ سے پرے پرے بھی ہم ، ہم ترے سنگ سنگ بھی

پیار سے غم کی آبرو ، آنکھ سے نم کی آبرو
ہاتھ کے ہاتھ تل گیا ، دھات کے ساتھ زنگ بھی

لاکھ عذاب اک طرف ، ایک شباب اک طرف
سیلِ ہوس میں بہہ گئے ، عشق بھی نام ونگ بھی

کوئی ستم نیا نہیں ، کوئی کرم نیا نہیں
مرکزِ التفات بھی ، جاں ہدفِ خدنگ بھی

خالد احمد

غزل

غم فراہم ہیں مگر ان کی فراوانی نہیں
اے گراں جانی ، یہاں کوئی بھی آسانی نہیں

چار سو ، اک برف بستہ عہدِ نم کا راج ہے
دھوپ میں حدّت نہیں ، دریاؤں میں پانی نہیں

یاد ہے کیا کام ہے ؟ اس شہر کا کیا نام ہے؟
سب کچھ اس جیسا ہے لیکن آسماں دھانی نہیں

زندگی کے دکھ ازل سے زندگی کے ساتھ ہیں
لوگ فانی ہیں مگر لوگوں کے دکھ فانی نہیں

روئی کے گالوں کی چادر بچھ گئی اس سال بھی
ایسا لگتا ہے کہ یہ بادل بھی بارانی نہیں

زندگی بھر صرف اسے پوجا مگر گھر بیٹھ کر
پاسدارنِ وفا کا کام دربانی نہیں

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

خالد احمد

غزل

برسوں نہ کسی کو سمجھ آئے گی کہانی
اِس بار ہوا ایسی جگائے گی کہانی

سچ پورا اِدھر ہے نہ اُدھر، پر یہ کشاکش
دو چار قدم آگے بڑھائے گی کہانی

رہ جائیں گی حیران زمانے کی نگاہیں
یوں راہ کی دیوار ہٹائے گی کہانی

کچھ روز کے بعد ایک جدا موڑ مڑے گی
رستے نئے دنیا کو سجھائے گی کہانی

دیکھو گے کہ لکھی ہوئی جن کی ہے انہیں بھی
اب اپنے اشاروں پہ چلائے گی کہانی

آ جائے گا جب ختم پہ اِس عمر کا قصہ
کچھ بھید ہمیں اپنے بتائے گی کہانی

لکھیں گے جو ہم وقت کے صفحات پہ عالی
کس طور وہ اغیار کو بھائے گی کہانی

جلیل عالی

غزل

بڑی عجیب سی آب و ہوا میں زندہ ہیں
یہ لگ رہا ہے کہ ہم اِک خلا میں زندہ ہیں

جو لوگ مہرِ خموشی لگا کے جیتے رہے
صدائیں اُن کی بھی میری صدا میں زندہ ہیں

شہید ہو گئے جو، اُن کو مت کہو مردہ
وہ اب بھی معرکۂ کربلا میں زندہ ہیں

خدا کرے کہ تری زندگی دراز کریں
دُعائیں جو مرے دستِ دُعا میں زندہ ہیں

کھُلے گا اُن کے لئے اب درِ بہشت ضرور
''کہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں''

کسے خبر ہے، مَیں کاغذ پہ لکھ سکوں کہ نہیں
خیال، جو مرے ذہنِ رسا میں زندہ ہیں

وفا کا عہد، جسے وُہ بھُلا چکے کب کا!
ہم آج تک اُسی عہدِ وفا میں زندہ ہیں

وہ زندہ لوگ تھے کیسے، جو رزقِ خاک ہوئے!
اور اب بھی دِل کے درِ نیم وا میں زندہ ہیں

جواز کیا ہے بھلا اُن کے زندہ رہنے کا
جو لوگ حالتِ کرب و بلا میں زندہ ہیں

انھی کو دیکھتی ہے آنکھ حجرِ اسود کی
جو منظر آج بھی غارِ حرا میں زندہ ہیں

بقا کا فلسفہ ہم نے سمجھ لیا ہے نسیم
بقا کو بھول کے شوقِ فنا میں زندہ ہیں

نسیمِ سحر

غزلیں

قیدِ ہستی سے رِہائی ہے تمھاری تیار
رکھیو خاورؔ میاں چلنے کو سواری تیار

یہ الگ بات کہ وہ صرفِ نظر کر جائے
ورنہ زنجیر ہے میرے لیے بھاری تیار

کس بھروسے پہ چلے سلسلۂ گفت وشنید
گُل ہی راضی ہیں نہ ہے بادِ بہاری تیار

دیکھیے اُس کی نگاہوں میں جچے یا کہ نہیں
ہم نے کر رکھی تو ہے کارگزاری تیار

اُس کا الطاف بچا لیتا ہے ورنہ خاورؔ
قبر تو روز ہی ہوتی ہے ہماری تیار

خاور اعجاز

گنبد ہی رہے اَب نہ وہ مینار یہاں پر
گِرتی ہے کوئی روز ہی دیوار یہاں پر

روشن تھے در و بام تمنّا کبھی جس کے
ملتے نہیں اُس بستی کے آثار یہاں پر

ہم لوگ تو خوشبو ہیں، عدو سے کوئی کہہ دے
کام آئیں گے کچھ تیر نہ تلوار یہاں پر

اِس کوچۂ ہستی میں دوبارہ نہیں رونق
لگتا ہے بس اِک بار ہی بازار یہاں پر

کام آئے نشیمن کہ قفس کے، مگر اے یار
اِک تنکا بھی رکھّا نہیں بیکار یہاں پر

آباد تو ہے شہرِ خموشاں ولے خاورؔ
گم ہو گئے کیا کیا لب ورُخسار یہاں پر

غزلیں

زباں پہ قفل پڑیں گے تو کون بولے گا
یہ بات مجھ سے جدا اور کون سمجھے گا

مہک تو جائے گا کمرہ گلاب پھولوں سے
جو زخم شاخ پہ آئیں گے، کون بھر دے گا

ہر ایک فرد کی گردش ہے اپنے محور تک
یہ مُلک اپنا ہے، پر اتنا کون سوچے گا

یہ گھر ہمارے، سکوں اور راحتوں کے امیں
یہ چھن گئے تو پنہ اور کون دے دے گا

ملے گا اِذنِ تکلّم کسے پسِ زنداں
زباں پہ قفل پڑیں گے تو کون بولے گا

یہ اک چراغ، کہ جلتا ہے چشمِ بینا ہے
اِسے بجھاؤ گے تو کس کو کون دیکھے گا

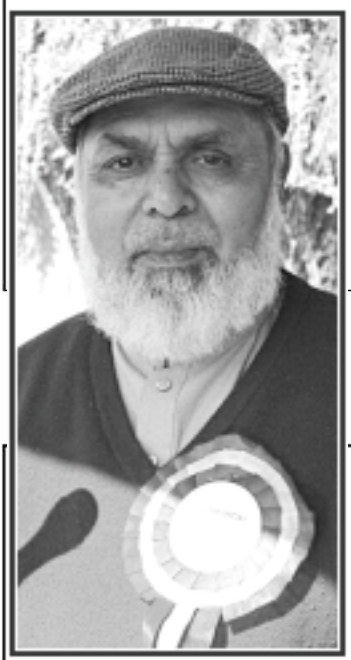

محمد انیس انصاری

وہ اک ستارہ جو ٹوٹا ہے آسماں سے ابھی
گیا تھا سُوئے فلک میرے خاکداں سے ابھی

نگاہ ڈھونڈتی ہے اُن سفر نوازوں کو
پلٹ کے آئے نہ جو دشتِ بے کراں سے ابھی

اسی کا سوگ مناتی رہے گی شامِ سخن
چلا گیا ہے جو اک شخص درمیاں سے ابھی

نجانے کون سی آسودگی کی خواہش میں
گزر رہا ہے ہر اک شخص امتحاں سے ابھی

انیسِ جاں! کوئی صورت نہیں بجز ہجرت
ہمیں نکلنا ہے اس شہرِ بے اماں سے ابھی

غزل

کیا عجب کل یہی معیارِ فضیلت نہ رہے
فخر تیرے لیے دستارِ فضیلت نہ رہے

تیرے لہجے میں رعونت اسی باعث آئی
اور اگر گرمیِ بازارِ فضیلت نہ رہے

اپنے ہمزاد بھی حشرات کی مانند لگیں
کوئی اتنا بھی گرفتارِ فضیلت نہ رہے

دکھ رعایا کا نہ تھا اس لیے معزولی پر
تخت والے بھی سزاوارِ فضیلت نہ رہے

آدمی کا ہے شرف حفظِ مراتب کا خیال
کچھ مناسب نہیں پندارِ فضیلت نہ رہے

منصبِ عشق ہے صورت گرِ اعزاز و مقام
اصل میں ہم ہی خبردارِ فضیلت نہ رہے

فاصلے ڈالتی ہے بیچ میں انسانوں کے
کاش وہ نام کی دیوارِ فضیلت نہ رہے

گلزار بخاری

غزلیں

کیسے کیسے نام کمائے لوگوں نے
مٹی کے معبود بنائے لوگوں نے

آج تلک آباد ہے دل کا ویرانہ
ورنہ کیا کیا نقش مٹائے لوگوں نے

چاند سا پیکر بند کنویں میں ڈال دیا
بعد میں کتنے اشک بہائے لوگوں نے

لے ڈوبے گی پھر ایسی تائید ہمیں
اب کی بار جو ہاتھ اٹھائے لوگوں نے

کیا بتلائیں وقت کے گدلے پانی میں
کیسے کیسے پھول بہائے لوگوں نے

ساتھ ہی اُس کو حرفِ آخر گروانا
حکم دیا یا دی ہے رائے لوگوں نے

اپنے لہو سے پیاس بجھانے کی خاطر
زہر میں کیا کیا تیر بجھائے لوگوں نے

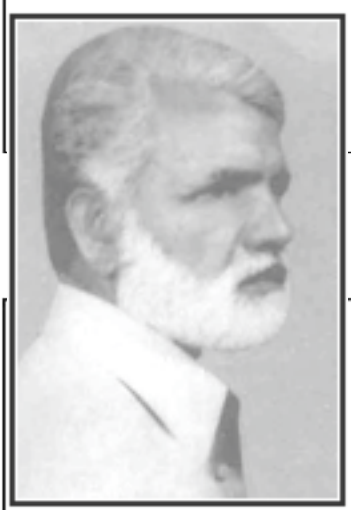

یعقوب پرواز

گرچہ سارا شہر ہے ناشادِ غم
کون ہے میری طرح برباد غم

اہتمامِ گریہ و ماتم نہ کر
کون سنتا ہے یہاں رودادِ غم

زیست کا کٹتا نہیں تنہا سفر
کچھ نہیں تو ساتھ لے لو زادِ غم

دیرپا ہوتے ہیں زخموں کے نشاں
غم ہوا کافور، اب ہے یادِ غم

بوئے پیرہن چلی ہے مصر سے
ختم ہونے کو ہے اب میعادِ غم

غزل

خالد علیم

ایک مضمون تو کیا، نُطق و بیاں تک لے جائیں
کاٹ کر اہلِ ہنر میری زباں تک لے جائیں

کبھی گزرا ہی نہ ہو جیسے گزرگاہ سے دل
لوگ آئیں، مرے قدموں کے نشاں تک لے جائیں

تجھ پہ کُھل جائے گا خوش خوابیِ جاں کا مفہوم
آ تجھے رہ گزرِ دل زدگاں تک لے جائیں

ایک دریائے رواں آنکھ کے اُس پار بھی ہے
آ تجھے ہم اُسی دریائے رواں تک لے جائیں

آ کہ ہم موج کی لرزش میں بھرے بیٹھے ہیں
آ تجھے سینۂ قلزم کی اماں تک لے جائیں

دل اکیلا ہے سرِ انجمنِ آئینہ
عکس اُبھریں تو مری تاب و تواں تک لے جائیں

کسی تعبیر کے اِمکان سے پہلے خالدؔ
کیا خبر ہے کہ مجھے خواب کہاں تک لے جائیں

غزل

ہو گئے توپوں کے رخ میرے ٹھکانے کی طرف
تھوکنا مہنگا پڑا مجھ کو زمانے کی طرف

کس کو معلوم کہ کب پاؤں میں بیٹھا ہوا شخص
اُٹھ کے چپ چاپ چلا آئے سرہانے کی طرف

ہم سے جو الجھا اسے جاتے ہوئے دیکھا گیا
یا شفاخانے کے بستر پہ یا تھانے کی طرف

سوچ لیں پھر نہ کہیں بعد میں پچھتانا پڑے
آپ اب میری طرف ہیں کہ زمانے کی طرف

اک نظر دیکھنا چاہوں گا کہ کیا گزری ہے
قید سے ہو کے رہا باغ پرانے کی طرف

بھوک وہ دکھتی ہوئی خلق کی رگ ہے راحت
کھینچ لاتی ہے پرندے کو جو دانے کی طرف

راحت سرحدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ میں نہیں، مرا پَرتَو نہیں، یہ میں تو نہیں
گماں سا کیوں مجھے گزرا؟ کہیں یہ میں تو نہیں

غزل

موجۂ مابین اُٹھا، پانی کا اندازہ ہوا
کیسی بے اندازہ عریانی کا اندازہ ہوا

میں تمھاری بے کرانی کو سمجھنے لگ گیا
کیا تمھیں میری بیابانی کا اندازہ ہوا؟

جیب خالی ہو گئی، بازار خالی ہو گئے
تب ذرا سا اپنی ارزانی کا اندازہ ہوا

تو نے انگلی سے اشارہ کیا کیا میری طرف
مجھ کو اپنی ہر پریشانی کا اندازہ ہوا

ایک دوجے کے قریب آنے سے اِتنا تو ہوا
ایک دوجے کی فراوانی کا اندازہ ہوا

میں نے کیا دیکھا کہ تو نے پھر سے دیکھا ہے مجھے
کیا تجھے بھی اِس نظر ثانی کا اندازہ ہوا؟

شاہین عباس

غزل

میں رو رہا ہوں، بظاہر ہنسی کے ہوتے ہوئے
کہ دکھ ہے دل میں کوئی اِس خوشی کے ہوتے ہوئے

میں بھول جاؤں نہ اپنی حیات کا مقصد
میں مر نہ جاؤں کہیں، زندگی کے ہوتے ہوئے

یہ لفظ رنگ ہیں، تصویر ہے غزل میری
میں بے ہنر تو نہیں شاعری کے ہوتے ہوئے

میں مطمئن ہوں بہت اپنے جیسے لوگوں میں
میں مطمئن ہوں بہت، بے گھری کے ہوتے ہوئے

میں رُک گیا ہوں تو ہر شے رکی ہوئی سی ہے
سو وقت پوچھ رہا ہوں، گھڑی کے ہوتے ہوئے

میں اس کے ہوتے ہوئے اور ڈھونڈتا ہوں کسے
میں کس گلی میں ہوں، اُس کی گلی کے ہوتے ہوئے

ابھی تو تیسرا منظر نہیں کھلا مجھ پر
پھنسا ہوا ہوں کہیں، ان کہی کے ہوتے ہوئے

نہ جانے کون ہے اقبال مجھ کو روکے ہوئے
تھکے ہیں پاؤں کیوں، آوارگی کے ہوتے ہوئے

اقبال سروبہ

غزل

دَر بیانِ چشمِ تر کچھ تو کہو
کیا خبر ہے نامہ بر کچھ تو کہو

ریگِ صحرا پھانکنے نکلے ہو تُم
کس لیے ہو دَربدر کچھ تو کہو

ٹمٹماتا ہے ستارے سا وہ کیا
کیا دھرا ہے بام پر کچھ تو کہو

طاقتِ پرواز جو تھی کیا ہوئی
کیا ہوئے وہ بال و پر کچھ تو کہو

کس نے رکھا ہے قدم دہلیز پر
لہلہائے بام و دَر کچھ تو کہو

کب تلک ہے یہ ردائے خامشی
تم ہو گر شوریدہ سر کچھ تو کہو

لفظ جو تم نے لکیرے کیا ہوئے
میرے پیارے قصّہ گر کچھ تو کہو

کیا خبر کس حال عظمیؔ پھر ملیں
ہجر شب سے پیشتر کچھ تو کہو

اسلام عظمی

غزل

جتن کے بعد کہیں اِس طرح ہوا ہوں میں
شدید چوٹ لگی اور ہنس پڑا ہوں میں

میں انتظار ہی کرتا رہا ہوں آہٹ کا
نجانے کتنے چراغوں میں جل بجھا ہوں میں

کسی بھی ذہن نے سوچا نہیں مجھے، ورنہ
خیال و خواب کے اندر پڑا ہوا ہوں میں

سکوں ملا مجھے بے رنگ ہو کے دنیا میں
ہر ایک رنگ کے کپڑے پہن چکا ہوں میں

سفر سے لوٹ کے آیا تو سو گیا تھک کر
کسی کے دھیان میں مدت سے جاگتا ہوں میں

معاملات میں حساس تھا میں بچپن میں
کہ جیسے گھر کے سب افراد سے بڑا ہوں میں

مکان سے نہیں شاہد گریز کی صورت
کہیں زمان سے باہر بھی جا بجا ہوں میں

شاہد اشرف

غزل

نوحہ کیسے لکھوں میں تیرا غزہ
دل فسردہ ہے ذہن ہے اُجڑا

جن کے چہروں کا رنگ تھا کچا
پہلی بارش میں پڑ گیا پھیکا

جب پڑھی ہے نمازِ استسقا
ابرِ رحمت بھی ٹوٹ کر برسا

سب لحافوں میں تھے مگر باہر
سخت سردی سے مر گیا بچہ

لی ترے عکس نے جو انگڑائی
ہو کے حیران آئنہ ٹوٹا

آنکھیں پل بھر میں ہوگئیں جل تھل
غم کا بادل تھا ٹوٹ کر برسا

پانی جس دم ڈبو رہا تھا مجھے
میں نے مٹھی میں بھر لیا دریا

رات کمرے میں سو رہی تھی وہ
چاند کھڑکی میں آکے بیٹھ گیا

ظلم کے بے کراں سمندر کو
پی ہی جاتی ہے صبر کی چڑیا

بعد مکے کے اور مدینے کے
کربلا ، شام اور نجف دیکھا

میری فردِ عمل کھلی جو عقیل
ایک دیوان میر کا نکلا

عقیل رحمانی

غزل

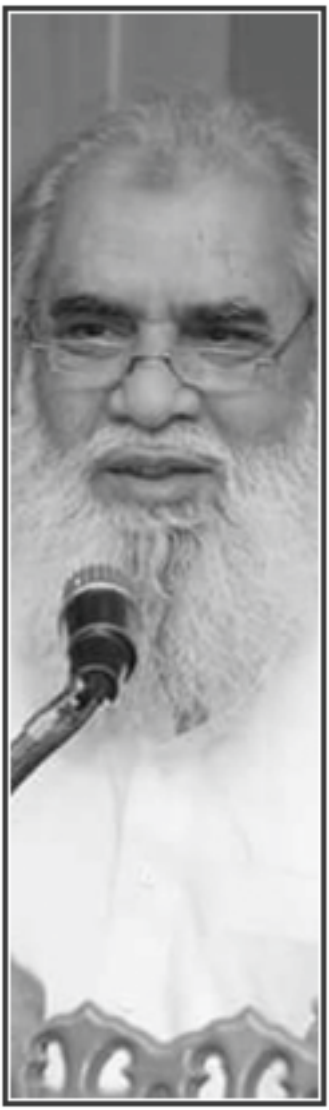

وہ جس گھڑی کہ مجھے قبر میں اتارا گیا
میں دیکھتا تھا کہ دنیا کا ہر سہارا گیا

کرو منادی کہ گاؤں بہانے والو اٹھو
اٹھو کہ شہر کی جانب سے اب کنارہ گیا

زمیں سے ان کو اٹھا لے گیا تھا مالک کل
کھلے گا جب انہیں واپس یہاں اتارا گیا

وہ پاس تھا تو تھا رنگین ایک اک منظر
گیا وہ دور تو آنکھوں کا ہر نظارہ گیا

مرے لیے کسی اعزاز سے نہیں ہے کم
کہ میرا نام تری بزم میں پکارا گیا

کسی کسی کو ملے ہے یہ منصبِ اعلیٰ
مَرا نہیں ہے تری راہ میں جو مارا گیا

قدم اٹھاؤں گا میں پھونک پھونک کر اکرم
کمال دیکھنا جنت میں جب دوبارہ گیا

اکرم ناصر

غزل

کسی کا کچھ اجارہ ہی نہیں ہے
محبت میں خسارہ ہی نہیں ہے

کدھر کو جانا ہے اب اس سے آگے
کہ منزل کا اشارہ ہی نہیں ہے

مجھے معلوم ہے انجامِ ہستی
بجز مرنے کے چارہ ہی نہیں ہے

انا کو روند کر کیسے پلٹتا
جسے ہم نے پکارا ہی نہیں ہے

اکٹھا کر دے ہم کو جوڑ دے پھر
یہاں ایسا ادارہ ہی نہیں ہے

اسے تفریق کر کے جب بھی دیکھا
تو منزل میں نظارہ ہی نہیں ہے

فریبِ دوستی پھر کیسے کھاؤں
کہ اب تو ضبط یارہ ہی نہیں ہے

میں کیسے مان لوں تو غم زدہ ہے
تری پلکوں پہ تارہ ہی نہیں ہے

سفینہ منزلوں کو کیسے ڈھونڈے
کوئی روشن منارہ ہی نہیں ہے

جلیل اب راکھ میں کیا ڈھونڈتے ہو
کوئی شعلہ ، شرارہ ہی نہیں ہے

جلیل اس کو کوئی جا کر بتائے
کہ بن اس کے گزارہ ہی نہیں ہے

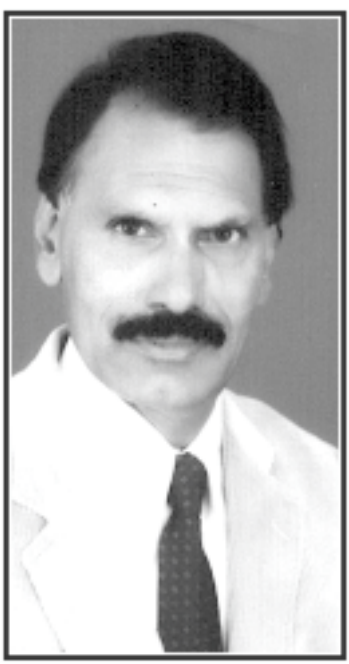

احمد جلیل

غزل

یہ جو افکار میں سوزِ نہاں رکھا ہوا ہے
کہاں کا بوجھ تھا، لیکن کہاں رکھا ہوا ہے

کسی نے کھینچ دی ہے حدِ فاصل سامنے یوں
وہ سنگِ میل جو اک بے نشاں رکھا ہوا ہے

دعا ہے ایک دن تم بھی ستارہ بن کے چمکو
سو نظروں میں خیالِ کہکشاں رکھا ہوا ہے

زمیں لیتی ہے اس سے رہنمائی بھی یہاں پر
زمیں کے سر پہ وہ جو آسماں رکھا ہوا ہے

نہ جانے کون ہے وہ بھاگ والا اس جہاں میں
یہ جس کے واسطے سارا جہاں رکھا ہوا ہے

کہاں ہم کو میسر ہیں ہمارے گھر کی خوشیاں
ہمارے نام تو بس اک مکاں رکھا ہوا ہے

ملن کی اب کوئی کیسے میسر ہو سہولت
سفر کو جبکہ تم نے درمیاں رکھا ہوا ہے

چلو افروز اب رخصت تعلق ہو گیا ہے
تعلق اب برائے داستاں رکھا ہوا ہے

افروز رضوی

غزل

بے مہر سے جو پیار کیا ہے تو مجھے کیا
خود زہر اگر تم نے پیا ہے تو مجھے کیا

میں نے تو بہت چاہا تمہیں کوئی خوشی دوں
قسمت میں تری غم ہی لکھا ہے تو مجھے کیا

راتوں کی سیاہی میں ضیا ڈھونڈ رہا ہے
دیوانہ اگر کوئی ہوا ہے تو مجھے کیا

سچ بات گوارا نہیں کرتا یہ زمانہ
اب کوئی سر دار چڑھا ہے تو مجھے کیا

ناراض کیا اس کے لئے تونے مجھے بھی
ہر کوئی خفا میرے سوا ہے تو مجھے کیا

مظہر امام

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غموں کا زہر کب سے پی رہے ہیں
نہ جانے کس طرح ہم جی رہے ہیں

غزل

مل کر مجھی سے میرا بچھڑنا عجیب ہے
اب عشق! ایسے بن گیا میرا نقیب ہے

تیری ادائیں، لہجہ ترا ، یہ ترا خیال
تو سانس میں سما گئی ، دل کے قریب ہے

مانگا ہے میں نے تجھ سے تجھی کو ہر ایک پل
تو نورِ عشق ، شہرِ وفا اور مجیب ہے

جاں سے جڑا ہے رشتۂ ایقان اس طرح
تو ہی تو میری جان کا یکتا حبیب ہے

آئیں گے کیسے حضرتِ عیسی یہاں کبھی
ہر شخص ہاتھ میں لیے زر کی صلیب ہے

جب سے ہوئی ہے دوستی تم سے مری ،شفیق
یہ عالمِ حیات ہی میرا رقیب ہے

محمد شفیق انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

راستے بھر کیا یونہی ہم کو پکارے جائیں گے
ساتھ دریا کے کہاں تک یہ کنارے جائیں گے

غزلیں

کس نے سمجھا ہے، ظرف پھولوں کا
کیسا ہوتا ہے ، ظرف پھولوں کا

بیچ ، کانٹوں کے بھی رہیں سرخوش
کتنا اچھا ہے ، ظرف پھولوں کا

صحنِ گلشن میں روک لیں خوش بو
ہم نے دیکھا ہے، ظرف پھولوں کا

زخم دیتے ہیں نت نئے ، دل کو
پھر بھی بھاتا ہے ،ظرف پھولوں کا

اس کی فطرت میں نازگی دیکھی
وہ بھی رکھتا ہے ، ظرف پھولوں کا

راس آئے ، نہ دھوپ کی حدت
یہ تو لگتا ہے ، ظرف پھولوں کا

میں جو شوکت ، اداس رہتا ہوں
دل کو کھاتا ہے ، ظرف پھولوں کا

شوکت محمود شوکت

جن کو دیکھیں ، کہتے ہیں یہ 'ہم دم' ہیں
دیوانوں کی ساری باتیں مبہم ہیں

جانے کس کے ہجر میں ہیں کچھ بے کل سے
جانے کس کی یاد میں آنکھیں پُرنم ہیں

لگتے ہیں کیوں رستے دیکھے بھالے سے
ہم سے بھی یہ رستے واقف، کم کم ہیں

شام ڈھلے دریا کو یوں خاموش نہ جان
تُو کیا جانے اس میں جو زیر و بم ہیں

اب تو اپنی صورت بھی پہچان نہ پائیں
آئینے میں جس کو دیکھا ، وہ ہم ہیں؟

بحرِ عصیاں میں ڈوبے اک مدت سے
شیطانوں کے رہ بر ابنِ آدم ہیں

دردِ الفت ہے ہم کو لاحق شوکت
دنیا والوں کو جانے کتنے غم ہیں

غزل

قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے برف
میں یہ سمجھا کہ اَن کہی ہے برف

اس کی تاثیر آگ جیسی ہے
سرد لہروں کی آذری ہے برف

بھیس دریا کا یہ بدلتی ہے
قریہ قریہ کی یاتری ہے برف

جب بھی سورج نے چھیڑ خانی کی
شرم سے پگھلی اور بہی ہے برف

کیسا بے رنگ سا ہے رنگ اس کا
اور جذبوں سے بھی تہی ہے برف

یہ کبھی مشتعل نہیں ہوتی
کوہساروں کی آگہی ہے برف

شدتیں آ رہی ہے موسم میں
ایسا لگتا ہے آخری ہے برف

فجر کی نیلگوں فضاؤں میں
کوہساروں پہ اک پری ہے برف

گرم کمروں میں موت کا ڈر ہے
اور مری موت کی خوشی ہے برف

چھونے والے کو یہ جلاتی ہے
کون کہتا ہے یک رُخی ہے برف

بس کے شیشوں سے میں نے دیکھا ہے
ان اجاڑوں میں دلکشی ہے برف

گھٹتی جاتی ہے یہ رُتوں کے ساتھ
غور کیجیے تو زندگی ہے برف

اعجاز روشن

غزلیں

دو دن کی اداسی کا سفر سالوں کے جیسا
برسات میں بھر جاتے ندی، نالوں کے جیسا

کچھ آئے پکڑ میں تو شمار اس کا بھی کر لیں
گنتی میں کہاں آئے گا دُکھ بالوں کے جیسا

کوئی بھی مجھے دیکھ کے پہچان نہ پایا
مجھ ذات میں ہے کون یہ بدحالوں کے جیسا

جو برسوں تلک کھلنے سے معذور رہے ہوں
خاموشی کا احساس ہے ان تالوں کے جیسا

اس ربط میں احساس دکھائی نہیں دے گا
دیوار کے کونوں پہ لگے جالوں کے جیسا

رخشندہ نوید

عشق و عاشقی جیسا شوق کم رکھا جائے
کوئی ہلکا پھلکا سا دل میں غم رکھا جائے

آنکھ بھی تو چاہے گی کچھ نہ کچھ بیاں کرنا
دل میں آگہی کو بھی، دم بدم رکھا جائے

تنگ جن پہ ہے دنیا اُن کو کیا دکھائی دے
سامنے بھلے ان کے جامِ جم رکھا جائے

دیکھ بھال اچھی کی، ماں نے چاروں بیٹوں کی
ایک چھت تلے سب کو تا بہم رکھا جائے

ہم نے کب کسی سے کچھ مانگنے کی کوشش کی
کچھ مگر زمانے میں، خواب نم رکھا جائے

گیت نامکمل تھا سُروں کی بندش تک
اس قدر تو سانسوں میں زیر و بم رکھا جائے

غزل

دیارِ عشق میں یہ بھی مقام آنا تھا
کسی کا ساتھ ہمیں عمر بھر نبھانا تھا

میں نفرتوں کا طرف دار کس طرح ہوتا
مجھے تو دیپ محبت کا اک جلانا تھا

چمن اجاڑ ہوا ہے تو مجھ کو یاد آیا
کسی شجر پہ پرندوں کا بھی ٹھکانا تھا

گزر گئے ہیں دل و جان سے تو سوچتے ہیں
محبتوں میں ہمیں اور کیا لٹانا تھا

کہیں قیام کی صورت نظر نہیں آئی
سفر طویل تھا اور بوجھ بھی اٹھانا تھا

جو مجھ پہ بیت رہی ہے مری کہانی ہے
جو ہو چکا ہے مکمل مرا فسانہ تھا

یہ کیا ہوا کہ سبھی راستے میں چھوڑ گئے
مسافتوں میں کہیں دور ہم کو جانا تھا

طلعت شبیر

غزل

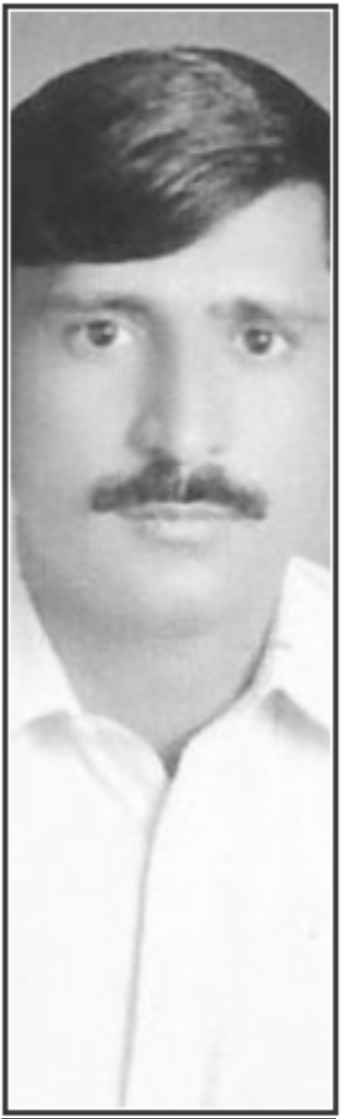

یوں ایک دن تجھے دلگیر کر کے چھوڑوں گا
میں تیرے ذہن کو تسخیر کر کے چھوڑوں گا

بلا سے ٹوٹ ہی جائے مرا قلم لیکن
کہانی اپنی میں تحریر کر کے چھوڑوں گا

رقم کروں گا ترے خد و خال کاغذ پر
خیال و خواب کو تصویر کر کے چھوڑوں گا

رہِ ادب کا مسافر ہوں ایک دن آخر
جہانِ فکر کو جاگیر کر کے چھوڑوں گا

مرے حصار سے باہر رہے گا تو کب تک
میں تیری سوچ کو زنجیر کر کے چھوڑوں گا

میں اپنی فکر سے قائل کروں گا دنیا کو
سخن کو حاصلِ تدبیر کر کے چھوڑوں گا

غزل کی سمت نیا عزم لے کے آیا ہوں
میں اپنے آپ کو اب میر کر کے چھوڑوں گا

مجھے جو اس نے ستایا ہے عمر بھر دانش
میں اپنے عشق سے تنویر کر کے چھوڑوں گا

اعجاز دانش

غزل

تلاشِ رزق میں نکلے ہوئے پرندے ہیں
بڑی ہی دور سے آئے ہوئے پرندے ہیں

چلیں گی ، سنتے ہیں ، اس بار آندھیاں کالی
فضا میں خوف ہے، سہمے ہوئے پرندے ہیں

تو سایہ دار شجر ہے تری عنایت سے
ہر ایک شاخ پہ بیٹھے ہوئے پرندے ہیں

ہمیں خبر ہے کہ اے برق تو نے گرنا ہے
ذرا ٹھہرنا کہ سوئے ہوئے پرندے ہیں

یہ وہ نہیں ہیں جو بچپن میں گھر میں آتے تھے
اگر چہ لگتا ہے ، دیکھے ہوئے پرندے ہیں

انھی سے رونقیں ہیں میرے دل کے آنگن کی
یہ ننھے بچے تو اڑتے ہوئے پرندے ہیں

جو آ رہے ہیں ترے شہر کی فضاؤں سے
ردائے درد میں لپٹے ہوئے پرندے ہیں

یہ آ کے بیٹھ گئے ہیں جو سوکھی شاخوں پر
رضا فراق کے مارے ہوئے پرندے ہیں

رضا اللہ حیدر

غزل

دھوپ کو چھاؤں بنانے والا
تھا کوئی درد بٹانے والا

عشق میں ہم بھی لیے پھرتے ہیں
زخم مجنوں کو دکھانے والا

کر گیا دنیا سے بیزار ہمیں
شہر دل چھوڑ کے جانے والا

تیری یادوں کے سوا کوئی نہیں
میری تنہائی میں آنے والا

عمر بھر کے لیے خاموش ہوا
مجھ کو ہر بات بتانے والا

میرے اندر ہیں مناظر سارے
میں ہوں تصویر بنانے والا

اپنے مالک سے ہنر مانگتا ہوں
لفظ میں دیپ جلانے والا

پیار احسان نہیں ہے شوکتؔ
لہجہ رکھیو نہ جتانے والا

افتخار شوکت

غزل

بھیج رہا ہوں یہ سندیسہ تیرے نام
میرا جیون ، میری دنیا تیرے نام

جتنا لکھا اور ابھی جو لکھنا ہے
پیار محبت والا قصہ ، تیرے نام

تُو سنتا ہے یار سُریلی آوازیں
کون کرے گا شور شرابہ ، تیرے نام

سارے موسم ، ساری دنیا کے پنچھی
ساری ندیاں ، سارے دریا تیرے نام

میں نے مکتب مسجد مندر چھوڑ دیا
یار ، کتابوں والا بستہ تیرے نام

رنگ برنگی دنیا کی یہ رنگینی
اور یہ سارا کھیل تماشا تیرے نام

مجھ سے میرے یار پُرانے کہتے ہیں
ہُو کا عالم اور یہ صحرا تیرے نام

یہ جو سات سُروں کا بہتا دریا ہے
اِس دریا کا قطرہ قطرہ تیرے نام

اِس رستے میں انصرؔ کوئی موڑ نہیں
دل نگری کا سیدھا رستہ تیرے نام

انصر حسن

نذرِ خالد احمد

مثال اس کی کہاں شہرِ بے مثال میں ہے
یہ معتکف جو ترے حجرۂ خیال میں ہے

تمھارا فن ہے کہ ہے اک طلسم ہوشربا
کسی نگاہ کا پرتو ترے کمال میں ہے

ہمارے عہدِ سخن میں ہے کہکشاں کی طرح
یہ روشنی جو ترے حرفِ لازوال میں ہے

ثنا گری ہو، قصیدہ ہو نظم ہو کہ غزل
ہر ایک صنف ترے دامنِ خیال میں ہے

بسی ہوئی ہے تری دھڑکنوں میں حرف کی لو
سخنوری کا بہاؤ نفس کی تال میں ہے

شعورِ نو کیلئے ہے تو اب ندیمؔ نما
کہ ان کا فیض بھی جاری ترے خصال میں ہے

تمھارے دم سے اب رونقِ سخن آباد
ترے سبب ہی یہ سرشاریٔ جمال میں ہے

تمام اہلِ ہنر تجھ کو مانتے ہیں سند
جو بے ہنر ہے وہ کیوں حیرت و ملال میں ہے

تری ہی سمت کھنچا آتا ہے دلِ سرور
کہیں بھی ہو یہ ترے قرب میں وصال میں ہے

سرور حسین نقشبندی

نذرِ حفیظ تائب

وصال و ہجر بہم کیف و کم میں ہوتے ہیں
وہ اپنے بعد بھی موجود ہم میں ہوتے ہیں

جو مل رہے ہیں ابھی تک حفیظ تائبؒ کو
کہاں وہ مرتبے جاہ حشم میں ہوتے ہیں

متاعِ حرف سے بڑھ کر نہیں کوئی دولت
سخنوروں کے حزینے قلم میں ہوتے ہیں

خیال و فکر کی بالیدگی، دل و نظر کا سکوں
انھی کے خامۂ معجز رقم میں ہوتے ہیں

خیال رہتا ہے ہر دم ثناء کے حلقے میں
یہ لوگ یوں بھی حصارِ کرم میں ہوتے ہیں

مرے سخن میں اُجالا ہے ان کی صحبت کا
انھی کے رنگ نمایاں قلم میں ہوتے ہیں

ہجوم اشک بھی ہوتا ہے انبساط کے بعد
خوشی کے لمحے بھی پوشیدہ غم میں ہوتے ہیں

دعائے نیم شبی ہو کہ مدحتِ سرکارؐ
کہاں کہاں و مری چشمِ نم میں ہوتے ہیں

کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں ندیمؔ و تائبؔ کو
یہ ماہتابِ سخن اب عدم میں ہوتے ہیں

پسِ وصال بھی لگتا ہے حضرتِ تائب
ہمارے ساتھ طوافِ حرم میں ہوتے ہیں

مجھے وہ خواب میں آ کر بتا گئے سرور
ثناء ہو جن کا حوالہ، ارم میں ہوتے ہیں

سرور حسین نقشبندی

غزل

خود میں مجھ کو ہی ڈھونڈتا ہے تو
سوچ سے میری ماورا ہے تو

زندگی بوجھ تو نہ تھی لیکن
ہاں مگر میرا حوصلہ ہے تو

راس آتی نہیں محبت بھی
ہر تعلق سے ماسوا ہے تو

جانے کس نے کسے گنوایا ہے
جانے کیوں اتنا سوچتا ہے تو

پھر ملیں گے کبھی کہیں شاید
اجنبی کتنا آشنا ہے تو

زندگی خواب کی امانت ہے
میری آنکھوں سے دیکھتا ہے تو

بخت میں اپنے؛ ساتھ تھا اتنا
سائے کے پیچھے بھاگتا ہے تو

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی ستم نیا نہیں ، کوئی کرم نیا نہیں
مرکزِ التفات بھی ، جاں ، ہدفِ خدنگ بھی

غزل

کہانی کچھ ایسے بنائی گئی ہے
کہ اس میں حقیقت چھپائی گئی ہے

فسانے کا اس پہ گماں ہو رہا ہے
ہمیں داستاں جو سنائی گئی ہے

حقیقت کا اس سے تعلق نہیں ہے
جو تصویر سب کو دکھائی گئی ہے

تمہارے لیے کھیل تھا اک محبت
مری عمر بھر کی کمائی گئی ہے

ہے اوقات دل کیا بجز قطرۂ خوں
مگر اس میں دنیا بسائی گئی ہے

مجھے ہے محبت زمانے کی دولت
تمہارے لئے بس یہ آئی گئی ہے

محبت ملی تو محبت کے بدلے
مری لذت آشنائی گئی ہے

راجہ عبدالقیوم

غزل

ہمیں تو حرفِ تسلی بھی تازیانہ ہوا
حصارِ ضبط کو ٹوٹے ہوئے زمانہ ہوا

درِ وصال تک آئی تھیں خواہشیں کتنی
مگر یہ باب کسی کے لیے بھی وا نہ ہوا

تم اپنے دل کی لگی بھی عیاں نہیں کرتے
ہمیں تو عشق ہوا اور والہانہ ہوا

اس ایک حرف کی تجسیم عمر بھر کی ہے
جو حرف اس کے لبوں سے کبھی ادا نہ ہوا

دھمال ڈالتی رہتی ہیں روز یادیں تری
یہ میرا دل نہ ہوا ، تیرا آستانہ ہوا

تمام عمر رہے ہیں نشانے پر دونوں
وہ میرا تیر ہوا یا مرا نشانہ ہوا

پکارتے ہی رہے ہم سرِ دیارِ طلب
ہمارے ساتھ کسی کا بھی رابطہ نہ ہوا

بدن کو بھیجتا رہتا ہے روز گھاؤ نئے
دماغ گویا اذیت کا کارخانہ ہوا

بس ایک خواب کی دوری پہ وصل تھا آصف
سرائے عشق سے جس روز میں روانہ ہوا

آصف شفیع

غزل

یار باشی میں زندگی گزرے
جتنی گزرے ہنسی خوشی گزرے

یہ قیامت بھی دیکھنا تھی ہمیں
آج وہ بن کے اجنبی گزرے

بام و در منتظر ہیں برسوں سے
وہ مرے شہر سے کبھی گزرے

یوں گزرتا ہے وہ گلی سے مری
جیسے آنکھوں سے روشنی گزرے

وہ بھی گزرے کبھی اسی رہ سے
ہائے جس راہ سے سبھی گزرے

ہر طرف بھیڑ ہے فقیروں کی
کوئی حاتم ، کوئی سخی گزرے

مدتیں ہو گئیں جنہیں دیکھے
ایسا لگتا ہے وہ ابھی گزرے

روح کا دشت کتنا ویراں ہے
اپسرا یا کوئی پری گزرے

دل کا منظر اداس ہے اصغر
اِس طرف یاد یار ہی گزرے

اصغر علی بلوچ

غزل

فیض رسول فیضان

ایسا نہیں کہ صرف خریدار گرم ہے
سچ پوچھیے تو سارا ہی بازار گرم ہے

خود سوچ لو کہ دُھوپ میں ہے کس قدر تپش
جاڑوں کی رُت میں سایۂ دیوار گرم ہے

جب ہیں میاں بھی گرم تو ہیں گولیاں بھی گرم
نسخہ اُبل رہا ہے کہ بیمار گرم ہے

بادِ صبا پہ ہوتا ہے صرصر کا شائبہ
ٹھنڈا سفر ہے، قافلہ سالار گرم ہے

ہے برف، پائے راہرواں پر جمی ہوئی
رہبر غریب ایسے میں بیکار گرم ہے

پیشِ نظر ہے منظرِ آتش بجاں اخیر
اللہ خیر! دیدۂ بیدار گرم ہے

مہماں نواز ہے بُتِ بے درد اِس قدر
جب بھی دُعا سلام ہو، ہر بار گرم ہے

دِل شعلہ زار ہے تو شرر بار ہے دماغ
فیضانؔ آج بندشِ اشعار گرم ہے

غزلیں

وصال میں بھی پیالہ چھلک نہیں سکتا
میں دیکھ کر اُسے پلکیں جھپک نہیں سکتا

مجھے تو حُسن کی پابندیوں نے روکا ہے
قریب جاتا ہوں لیکن لپک نہیں سکتا

اُسے ہے پاس حیا میرے پاس آ کر بھی
وہ بے خودی میں بھی زلفیں جھٹک نہیں سکتا

اے اہلِ حسن! ضروری ہے عشق ساتھ رہے
بغیر سیپ کے گوہر چمک نہیں سکتا

فضائے سبز میں اس دل کی آبیاری کر
غُبار دشت میں یہ گُل مہک نہیں سکتا

وہی کرے گی یہاں پارسائی کا دعویٰ
کہ جس کے سَر سے دوپٹہ ڈھلک نہیں سکتا

یہ ساز و نغمہ مبارک ہو بزمِ خُوباں کو
شریف گھر میں تو گھنگرو چھنک نہیں سکتا

یہ لازمی ہے کہ اپنوں کی گود میں مچلے
کہ دستِ غیر میں بچہ ہمک نہیں سکتا

یہ آفتاب اگر سانس روک لے اپنی
تو پھر زمین کا دل بھی دھڑک نہیں سکتا

آفتاب خان

احساس کی خُو بُو کسی بے درد میں کب ہے
یہ سچ ہے، مروّت بھلا ہر فرد میں کب ہے

وہ حُسن تو اپنی ہی پرستش میں ہے غلطاں
اور عشق نبھانے کا جُنوں مرد میں کب ہے

دیتا ہے دلاسہ تو بہت ہجر میں لیکن
وہ شخص پریشان مرے درد میں کب ہے

تاثیر سے خالی ہیں ہر اک نظم کے مصرعے
پھُولوں سی مہک ہوتی گلِ زرد میں کب ہے

اُڑتا ہے غبار ایسا کہ چہرے سبھی گُم ہیں
منزل کا مگر کوئی نشاں گرد میں کب ہے

غزل

جیت کر کھیل، ہار مانگتے ہیں
گُل فروشوں سے یار مانگتے ہیں

ترس آئے ہے ان کی چاہت پر
بھیک میں جو بھی پیار مانگتے ہیں

پورا مدہوش ہونا ٹھیک نہیں
ہم ذرا سا خمار مانگتے ہیں

جو زمیں تھی سزائے آدم کو
ہم وہاں بھی قرار مانگتے ہیں

صندلیں بانہوں ، زلفِ پیچاں کا
چار ، چھ دن حصار مانگتے ہیں

لعل و گوہر تمہیں مبارک ہوں
خاک ہی خاکسار مانگتے ہیں

ہو عنایت ذرا سا وقت کوئی
ہم کہاں بار بار مانگتے ہیں

جدولِ عاشقانِ حُسن پہ ہم
پہلا نمبر شمار مانگتے ہیں

جاں کے لالے پڑے یہاں شاہد
آپ باغ و بہار مانگتے ہیں

شاہد فرید

غزل

اُلجھا ہوا ہر ایک یہاں سازشوں میں ہے
رشتے سے منسلک ہے مگر رنجشوں میں ہے

اک شام ہجر کی مری آنکھوں میں آ بسی
اک لمس کا وجود مری انگلیوں میں ہے

پلکیں جھپکنا بھول گئی اس کی یاد میں
یعنی عجب نشہ سا مرے رتجگوں میں ہے

طے کر رہی ہوں ایسے ترے ہجر کی خلیج
قربت زدہ خمار تری دوریوں میں ہے

موسم کبھی خلوص میں حائل نہیں ہوئے
اک شخص میرے ساتھ بدلتی رُتوں میں ہے

یہ تو کھلا کہ پشت بھی محفوظ اب نہیں
اب دیکھنا ہے کون ہماری صفوں میں ہے

اس درجہ خوبرو تو نہیں ہے مرا وجود
یہ کون روبرو مرے ان آئنوں میں ہے

دل میں مچل رہا ہے ثمینہ حسین راگ
نغمہ صفت بہاؤ ابھی پانیوں میں ہے

ثمینہ سیّد

غزل

صغیر احمد صغیر

مقام جس کا جہاں تک ہے وہ وہیں تک ہے
جو آستین کے قابل ہے آستیں تک ہے

وہ چاہتا ہے رکوع و سجود دل سے ہو
ہم ایسے لوگ سمجھتے رہے جبیں تک ہے

نظر سے آگے ہمارا کوئی تقاضا نہیں
ہمارا تم سے تعلق ہی بس یہیں تک ہے

زمیں پہ پاؤں مرے لگ نہیں رہے تب سے
رسائی جب سے مری عکسِ دلنشیں تک ہے

صغیر ہاں سے ملائی جب اس نے ہاں تو کھلا
نہیں نہیں کا مزہ بھی نہیں نہیں تک ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

روز کے روز اک گنج بسائیں
کاش یہ دُکھ تنکے بن جائیں

غزل

اکرم جاذب

اک عمر انتہاؤں کی قائم مثال کی
اب ہم کو راہ بھول گئی اعتدال کی

کچھ زخم زندگی سے بھی پیارے ہیں کیا کروں
صورت نکل نہ آئے کوئی اندمال کی

حیرت ہے آپ کی نہیں اس سے مماثلت
ماضی سے جو شبیہہ بنائی ہے حال کی

کرنے لگے ہیں پہلو تہی سائے بھی اگر
سمجھی ہوئیں نشانیاں ظاہر زوال کی

ہم ہی فریب کھانے کے قائل نہیں رہے
چلتے ہیں چال آپ تو اب بھی کمال کی

تازہ وبال پال کے تازہ سخن کہے
کتنے جتن کیے تو یہ رونق بحال کی

اپنا بھی واپسی کا ارادہ نہیں کوئی
مانا کہ پیش قدمی کسی نے محال کی

جو چاہے گنگنائے نہیں کوئی معترض
جاذبؔ وہ اک غزل ہے کسی خوش خیال کی

غزلیں

کافی کچھ میں سنا چکا احباب
ڈھل گئی رات ، میں چلا احباب

مجھ کو رنگوں میں ڈھونڈ لیجے گا
میرا سادہ سا ہے پتہ احباب

آئیں اب روئیں ہنسنے والوں کو
رونے والوں پہ رو لیا..... احباب

وقت پڑنے پہ کوئی ساتھ نہیں
ویسے بکھرے ہیں جا بجا احباب

اس کی باتیں ہی کھا گئیں اس کو
اس کے کتنے تھے یاخدا احباب

ویسے کہنے کو مل گئی دنیا
ایک انساں نہ مل سکا احباب

شاکر خان بلیچ

سند ضعیف سہی راویان جانتے ہیں
ہے اصل شجرہ کہاں ، کاتبان جانتے ہیں

قرینِ موت ہے اسپ یقیں کی تیز ردی
ہماری آنکھ میں اُترے گمان جانتے ہیں

مَماثت ہے کسی کی تو اس کا مسئلہ ہے
سب اہلِ حَرف ہماری اُڑان جانتے ہیں

تمام درد مِرے دَر پہ آئے بیٹھے ہیں
یہ میرے سینے کو دارالامان جانتے ہیں

خلا کے دکھ تو سمجھتی ہیں دل کی دیواریں
مری اداسی بھی خالی مکان جانتے ہیں

میں آ گیا ہوں تو اب خیر لے کے جاؤں گا
مری طلب کو مرے میزبان جانتے ہیں

کہ دل چُراتا نہیں ہوں میں چھین لیتا ہوں
جو جانتے ہیں مجھے، میری جان، جانتے ہیں

غزل

کسی کا حق برابر میں دبانا چاہتا ہوں
عجب انداز سے کرسی بچانا چاہتا ہوں

کڑکتی دھوپ میں جو دعوتِ آسودگی دیں
شجر احساس کے ایسے اگانا چاہتا ہوں

درونِ ذات جو مجھ کو مسلسل چاٹتی ہے
میں اس دیمک سے چوبِ فن بچانا چاہتا ہوں

تری خاطر میں رسوائی کے صحرا چھان کر بھی
دیارِ شوق کے پتھر اٹھانا چاہتا ہوں

جہاں پل کی خوشی کی گود، میں لاکھوں الم ہوں
میں جان اس زندگانی سے چھڑانا چاہتا ہوں

پتہ کچھ تو چلے میں کس قدر بہکا ہوا ہوں
سو اپنے روبرو خود کو بٹھانا چاہتا ہوں

غزل میں ڈھال کر تیرے درخشاں خال و خد کو
میں اک نایاب فن پارہ بنانا چاہتا ہوں

اسے منزل بنا کر چل پڑا ہوں جب میں فرحان
تو سنگِ میل رستے سے مٹانا چاہتا ہوں

سرور فرحان

غزل

مسعود تنہا

مہرباں بدلا نہیں نامہرباں بدلا نہیں
ہم فقیروں نے کبھی بھی آستاں بدلا نہیں

جھڑ چکے تھے ہر شجر کی شاخ سے برگ وثمر
ان پرندوں نے تو پھر بھی آشیاں بدلا نہیں

گھر سے نکلے ساتھ جس کے تادمِ آخر رہے
منزلوں کی چاہ میں بھی کارواں بدلا نہیں

راز دارانِ محبت کی وفا تو دیکھئے
راز کھلنے پر بھی ہم نے رازداں بدلا نہیں

میرے ہمسائے بہت بیدرد ہیں تنہا مگر
چاہے تنہائی رہی ہے پر مکاں بدلا نہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہماری سیرتیں تھیں ایک جیسی
کوئی خوش رو ، کوئی کم رو نہیں تھا

غزل

پوری کہیں یہ حسرتِ دیدار ہی نہ ہو
رستے میں کوئی آہنی دیوار ہی نہ ہو

مجھ سے نکل نہ جائے کہیں آگے قافلہ
میری عدو کہیں مری رفتار ہی نہ ہو

رکھا ہے جس نے منزلِ ہستی سے دُور دُور
اپنا کہیں وہ قافلہ سالار ہی نہ ہو

مجمع لگا ہوا ہے جو ساحل کے آس پاس
کشتی کی سمت دیکھیے منجدھار ہی نہ ہو

ایسا نہ ہو کہ دل میں رہیں دل کی حسرتیں
ایسا نہ ہو کہ پیار کا اظہار ہی نہ ہو

ڈرتا ہوں اس برس جو ادا کر رہا ہوں میں
بھولے ہُوئے فسانے کا کردار ہی نہ ہو

دُنیا نے جس کو ڈر کی علامت بنا دیا
وہ راہِ پُرخطر کہیں ہموار ہی نہ ہو

میں جا رہا ہوں لے کے ہتھیلی پہ اپنی جاں
اُن کو کہیں یہ جاں مری درکار ہی نہ ہو

جس کو نگاہ پھیر کے تُو نے جھڑک دیا
وہ سوختہ بدن ترا بیمار ہی نہ ہو

اُٹھنے لگا ہے شور جو دھڑکن کے درمیاں
دل پر گزشتہ یاد کا آزار ہی نہ ہو

بھیجا ہے اُس نے پھول جو تحفے میں اے نبیل
دیکھو تو غور سے وہ کہیں خار ہی نہ ہو

نبیل احمد نبیل

غزل

یہ خموشیوں کا نگر کوئی سبھی طائروں سے ڈرا ہوا
اسے نغمگی سے گریز تھا یہ صداؤں سے ہے مرا ہوا

کئی لوگ مجھ کو ملے مگر فقط ایک ان میں تھا معتبر
وہ جو گرد سے تھا اٹا ہوا کسی بات پر تھا مٹا ہوا

کوئی اس کی سمت سفر کرے کوئی اس کو جا کے خبر کرے
وہ جو ایک عرصے سے قید تھا غمِ زندگی سے رہا ہوا

یہ جو دیکھنے میں حسین ہے یہ بڑی عجیب زمین ہے
یہاں جھوٹ بیٹھا ہے تخت پر اور سچ ہے پاس کھڑا ہوا

جو بھنور سے ناؤ الجھ پڑی تو کھلا یہ بھید اسی گھڑی
وہ جو ابتدا میں تھا ناخدا وہی شخص سب کا خدا ہوا

تجھے کیا خبر ترے ہجر میں مجھے کیا کمال دیا گیا
کبھی جیتے جی تھا میں مر گیا کبھی جی اٹھا تھا مرا ہوا

بڑا قیمتی ہے یہ غم عطا اسی واسطے یہ عزیز ہے
مرے ساتھ اس نے جنم لیا مرے ساتھ ساتھ بڑا ہوا

عطاالعزیز

غزل

تیز چلتی ہے یہ آرام کہاں دیکھتی ہے
زندگی عشق میں انجام کہاں دیکھتی ہے

خود کو گروی بھی رکھا خواب بھی سستے بیچے
خواہشِ وصل بھلا دام کہاں دیکھتی ہے

دنیا کہتی ہے مری آنکھ نے دنیا دیکھی
اس نے دیکھے ہیں جو آلام کہاں دیکھتی ہے

اب بھی موقع ہے بڑا نام بڑا رہنے دے
تیغ چلتی ہے تو پھر نام کہاں دیکھتی ہے

فکرِ تعمیر میں تخریب کو شامل نہ کرو
نقص تو ڈھونڈتی ہے کام کہاں دیکھتی ہے

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھ کب جھپکے گی، بکھرے گی یہ زنجیر کہاں
اے مرے خواب رواں! ہے تری تعبیر کہاں

غزل

اچھی طرح سے بات کو سوچا نہیں گیا
حالاتِ ناگوار کو سمجھا نہیں گیا

شاید وہ جا چکا ہے یہ بستی ہی چھوڑ کر
اس راہ سے گزرتے وہ دیکھا نہیں گیا

مجھ سے کئے گئے ہیں سوالات تو بہت
کہنا جو چاہتا تھا وہ پوچھا نہیں گیا

کس کام میں ہے جانے وہ مصروف آج کل
مجھ کو کبھی وہ چھوڑ کے تنہا نہیں گیا

گردش خیالِ خام کی پیہم ہے ذہن میں
لگتا ہے اس کو ٹوٹ کے چاہا نہیں گیا

وہ کر گیا ہے دل میں مرے گھر کچھ اس طرح
کوشش کے باوجود بھلایا نہیں گیا

شب بھر دل و دماغ میں کیسی یہ جنگ تھی
اک لمحہ بھی سکون سے سویا نہیں گیا

مرنے کے بعد میرے خیالی کہیں گے لوگ
تو جا چکا ہے پر ترا چرچا نہیں گیا

زبیر خیالی

غزل

چھیڑا جو مضراب نے ہی تار نہیں ہے
چہرۂ اغیار پر غبار نہیں ہے

لطفِ مئے احمر اس کی چشم کی پتلی
پنجۂ مژگاں پہ آشکار نہیں ہے

ہاں بتِ محشر خرام سے ہے تعلق
ہے یہ عجب اس پہ اختیار نہیں ہے

بیٹھے ہیں عشاق نشۂ غرضی میں
ساغر و خم پر کچھ اعتبار نہیں ہے

ہوتے نہیں منع خوب زُور رقیباں
زورِ مصارع کہ بے قرار نہیں ہے

سایہ معنبر ہے زلف سے ہوئی مہکار
باقی سرور اور ہے خمار نہیں ہے

نازکی اس رہ پہ دھیان میں رہے گل چیں
کوئی یہاں ایک گل عذار نہیں ہے

محمد ادریس قریشی

غزل

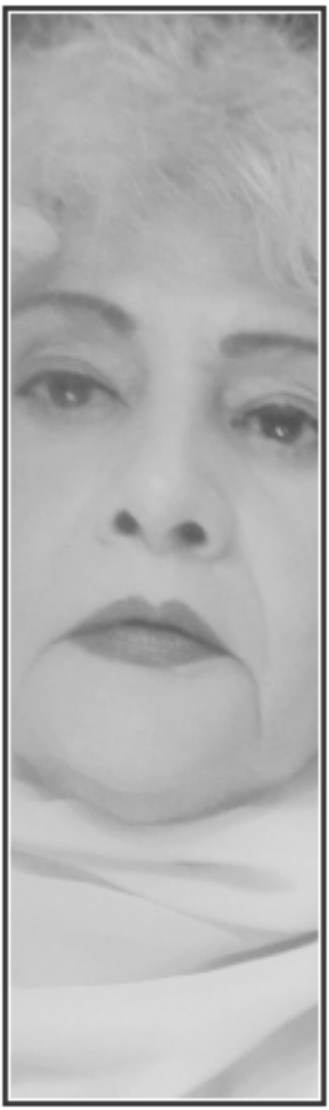

آنکھوں میں جس کے خواب تھے یہ وہ جہاں نہیں
ہم دِل گرفتہ گر نہیں خوش بھی یہاں نہیں

وہ اَبتری ہے عرصہ گہِ کائنات میں
جائے اماں کہیں بھی پسِ آسماں نہیں

تھے عَرش زاد ہم سو زَمیں کے نہ ہو سکے
کیا اِنتشار سے یہ ہمارے عیاں نہیں !

اِک ساعتِ بعید میں گُزرے تھے رفتگاں
ہر سَمت ہے غُبار کہیں کارواں نہیں

ہم پیچ و خَم میں راہ کی اُلجھا دیئے گئے
منزل کا دُور دُور تَلک بھی نشاں نہیں

کاجَل بَہا تو رُخ پہ اُبھر آئے داغ دل
سوز اَلم تو ورنہ کہیں سے عَیاں نہیں

مجھ پر کُھلی ہیں عشق کی جولانیاں سو اب
جاں کا زیاں گوارا ہے دل کا زیاں نہیں

کِس درجہ خوش جواز ہَوا کا چلن رہا
بُجھ بھی گئے چراغ پہ ماتم کُناں نہیں

انجم عثمان

غزل

ساری مخلوق یہ دہائی دے
کسی بندے کو مت خدائی دے

اپنے اندر کبھی میں جھانک سکوں
اس قدر بس مجھے رسائی دے

روشنی تو نظر نہ آئے کہیں
بس اندھیرا مجھے دکھائی دے

بھائی ہو گر تو دوستوں جیسا
دوستوں جیسا مجھ کو بھائی دے

غمِ جاناں ہے یا غمِ دوراں
کیا کروں میں نہ کچھ سجھائی دے

ہے تمنا یہی مری اشفاق
اپنے در کی مجھے گدائی دے

محمد اشفاق بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تمام عمر بس اک رت جگے میں بیت گئی
تمام عمر ہم اک مہرباں کے ساتھ رہے

غزل

زلفوں میں قید خود کو سرِ شام کر بیٹھا
ہر ایک غم کو نذرِ تہہِ جام کر بیٹھا

میں مطمئن ہوں اپنے کیے پر خدا گواہ
سب کچھ خوشی سے اپنی ترے نام کر بیٹھا

ہجرت کا کوہِ بارِ گراں سر سے پھینک کر
واللہ! کہ تزئینِ در و بام کر بیٹھا

اُڑنا بھی بھلا کیسے قفس سے یہ پرندہ
اِک خواہشِ دانہ ہی اُسے دام کر بیٹھا

اِس سوچ میں غلطاں ہیں ترے چاہنے والے
کرنا تھا کسے رام، کسے رام کر بیٹھا

عشاق کی محفل میں مجھے کر کے اشارہ
جو بات چُھپانا تھی اُسے عام کر بیٹھا

جس کام کے کرنے میں رہا موت کا کھٹکا
وہ کام ہمارا دلِ ناکام کر بیٹھا

آ دیکھ مرے حُسنِ تغزل کا کرشمہ
میں نذر، غزل حافظ و خیام کر بیٹھا

غم تجھ سے بچھڑنے کا نہیں کوئی ندیم اب
''جو کام کرنا تھا مجھ کو، وہ کام کر بیٹھا''

ریاض ندیم نیازی

غزل

اس لیے خوشیوں کی بہتات نہیں رہتی ہے
اب مری تجھ سے ملاقات نہیں رہتی ہے

وقت کے ساتھ خدوخال بھی ڈھل جاتے ہیں
عمر بھر حُسن کی سوغات نہیں رہتی ہے

میں نے دنیا کو کبھی دل میں جگہ دی ہی نہیں
میرے حجرے میں یہ بد ذات نہیں رہتی ہے

جس قدر سخت ہوں، تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں
زندگی بھر تو کہیں رات نہیں رہتی ہے

میر نے بات بہت خوب کہی ہے جامی
عشق میں عزتِ سادات نہیں رہتی ہے

مستحسن جامی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پسِ لب و رُخِ اعدا رہا مرا پیارا
نہ اُس سے جیت سکا میں، نہ مجھ سے وہ ہارا

غزل

لوگ لوگوں سے ضرورت کے سبب ملتے ہیں
ایک ہم ہیں جو محبت کے سبب ملتے ہیں

مل گئے ہیں تو کرو قدر ہماری، لوگو!
ہم سے درویش تو قسمت کے سبب ملتے ہیں

کیسے سمجھے گا وہ غربت کی اذیت کو، جسے
ڈھیر دولت کے وراثت کے سبب ملتے ہیں

خود کو تُو آلِ نبی کہتا ہے، سبحان اللہ
ہم تجھے بس اسی نسبت کے سبب ملتے ہیں

یہ حقیقت ہے ولایت کے مراتب سارے
بس محمدؐ کی اطاعت کے سبب ملتے ہیں

رنگ بدلا ہے لہو کا بھی زمانے کی طرح
اب تو بھائی بھی ضرورت کے سبب ملتے ہیں

جن سے ہوتی ہے پذیرائی کسی شاعر کی
ایسے اشعار ریاضت کے سبب ملتے ہیں

ہو کے بیمار کُھلے بخت ہمارے، اکمل!
وہ ہمیں روز عیادت کے سبب ملتے ہیں

اکمل حنیف

غزل

ہم چاہتے ہیں اہلِ ہنر میں جلی رہیں
لیکن ہمارے عیب جہاں سے خفی رہیں

دل میں نہ دوستی کے لیے بے کلی رہے
بہتر ہے ایک دوسرے سے اجنبی رہیں

اے رہ روانِ شوق یہ عبرت کی بات ہے
اہلِ جنوں سے کوہ و بیاباں تہی رہیں

جو لوگ ساحلوں سے اترتے کبھی نہیں
شرمندہ پانیوں سے ہمیشہ وہی رہیں

ملتے ہیں میرے ساتھ بھی احباب کی طرح
شامل وہ میرے دشمنوں کی صف میں بھی رہیں

جو خاک کا شرف ہے فلک کو کہاں نصیب
ہم لوگ چاہتے ہیں سدا آدمی رہیں

دیتے ہو کس لیے ہمیں جھوٹی تسلیاں
عاصم کے خالی ہاتھ ہیں کیسے غنی رہیں

عاصم بخاری

غزلیں

ایسی ٹکرائی ایک سندر سے
آنکھ ہٹتی نہیں ہے منظر سے

حوصلہ دے رہا تھا مجھ کو وہ
خود جو ٹوٹا ہوا تھا اندر سے

مجھ سے بڑھ کر وہ تشنہ لب نکلا
پانی مانگا جو میں نے ساگر سے

بات کر کے ہوا یہ اندازہ
تیز لہجہ تھا اس کا خنجر سے

توڑ سکتا نہیں اسے افضل
گہرا رشتہ ہے میرا ساغر سے

افضل ہزاروی

نظر جب بھی آئیں شجر اور پرندے
بہت دل کو بھائیں شجر اور پرندے

ادھوری ہے ورنہ یہ تصویرِ فطرت
مکمل بنائیں شجر اور پرندے

جنھیں دیکھ کر دل میں راحت سی اترے
وہ منظر دکھائیں شجر اور پرندے

ہے دم سے انھی کے گلستاں میں رونق
چمن کو سجائیں شجر اور پرندے

بسیرا ہو ایسی جگہ پر ہمارا
ہوں بس دائیں بائیں شجر اور پرندے

تمہیں بھول پائے نہ گوشے چمن کے
مجھے یاد آئیں شجر اور پرندے

لگے سُونا سُونا سا افضل گلستاں
اگر روٹھ جائیں شجر اور پرندے

غزل

گماں ہے یہ ہماری سادگی کا
اسے ہم بھول بیٹھے ہیں کبھی کا

لبوں پر خامشی کا قفل ڈالو
ابھی کھولو نہ دروازہ گلی کا

دیے نے بجھتے بجھتے راز کھولا
یہ ظلمت ہے اشارہ روشنی کا

سحر دم گل سے اک تتلی نے پوچھا
تمھیں بھی دکھ رلاتا ہے کسی کا

میں خود اپنے مقابل آ گیا ہوں
مزا آئے گا اب کے دشمنی کا

وہ دروازے کو کیا پہچانتی تھی؟
قدم کیوں رک گیا تھا اونٹنی کا

تری آواز آئی تھی کہیں سے
ہمیں دھوکہ ہوا تھا روشنی کا

مجھے الجھا رہے تھے گفتگو میں
تماشہ کر رہے تھے بے بسی کا

میں گم سم ہو گیا تھا اس کے آگے
مزہ وہ لے رہا تھا حیرتی کا

وہ سر اثبات میں ہلتا تھا آسی
نگاہوں میں تاثر تھا نفی کا

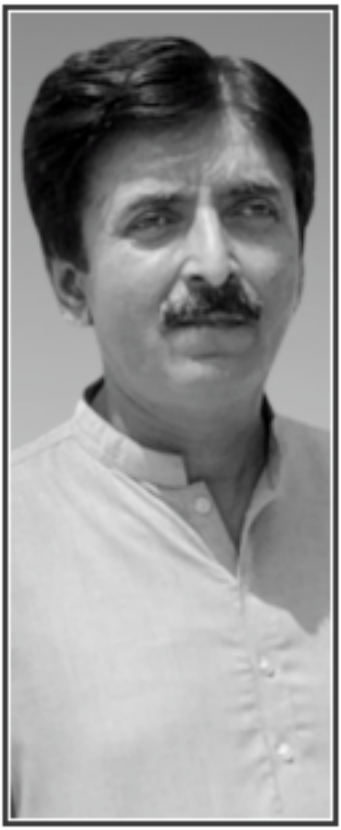

محمد نور آسی

غزل

ستارہ شب کو جہاں آسماں خرام ہوا
وہیں پہ صبح کو سورج بھی شاد کام ہوا

کھِلا نہ شعلۂ گل نخلِ آرزو پہ کبھی
جو شاخِ زرد سے اترا تو لالہ فام ہوا

نشیبِ خاک میں ٹھہری تھی دعوتِ شیراز
کہ بعدِ مرگ ضیافت کا اہتمام ہوا

شرابِ سرخ سے لبریز تھا ترا کوزہ
مرے قبیلے میں جس روز قتلِ عام ہوا

جو اصطبل میں سیاہ و سپید تھا ابلق
وہ رزم گاہ میں اترا تو بے لگام ہوا

عطا ہوئی ہے متاعِ سخن وراثت میں
کہ جینیات کی برکت سے نیک نام ہوا

عابد رضا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تن آج جلایا ہے، کل راکھ اُڑا دیں گے
وہ نام کو دو دن میں، دشنام بنا دیں گے

غزل

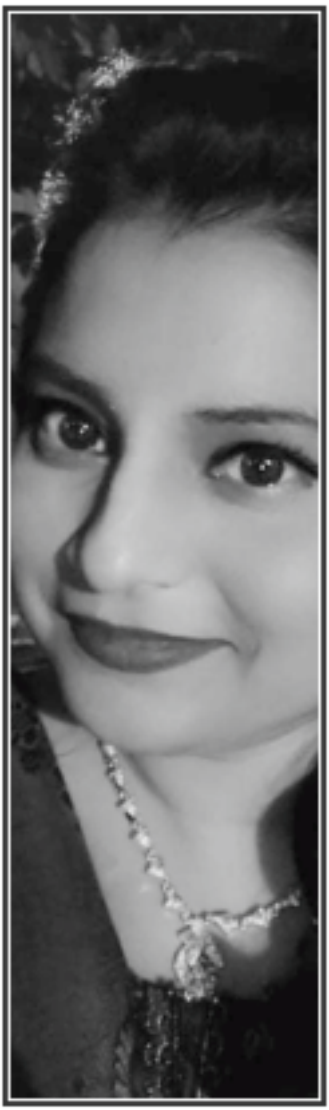

یہ جو اس دل کی بیابانیاں ہیں
تیری بخشش ہیں مہربانیاں ہیں

ختم سانسوں کے ساتھ ہی ہوں گی
راہ میں اتنی بدگمانیاں ہیں

آج کے دور میں محبت کی
کس قدر مختصر کہانیاں ہیں

سب نصیبوں کی قید میں ہیں یہاں
جتنے راجا ہیں جتنی رانیاں ہیں

پھول کی پنکھڑی سا دل میرا
اور پہاڑوں سی سرگرانیاں ہیں

روح پر جابجا رفوکاری
یاد ماضی کی کچھ نشانیاں ہیں

جل گئیں انگلیاں بھی خط کے ساتھ
کس قدر اپنی بے دھیانیاں ہیں

باقی کیا ہے سحر ہمارے پاس
دشت ہے اور رایگانیاں ہیں

نادیہ سحر

غزل

دیا کوئی جلا کر دیکھتے ہیں
ہوا کا منہ چِڑا کر دیکھتے ہیں

اندھیرا جو اُجالے میں بدل دے
اُسی کو ہم بُلا کر دیکھتے ہیں

کہاں لیلائے فن پردہ نشیں ہے
چلو! پردہ اُٹھا کر دیکھتے ہیں

ہمیشہ غم چشیدہ ہی رہے ہیں
چلو اب مسکرا کر دیکھتے ہیں

سخن فہمی اسے مرغوب ہے تو
اسے غزلیں سُنا کر دیکھتے ہیں

ہے کیسی کیفیت ان دل جلوں کی
ذرا دل کو جلا کر دیکھتے ہیں

وہ کتنا نکتہ بین و نکتہ داں ہے؟
نئے نکتے اُٹھا کر دیکھتے ہیں

گریباں چاک رکھا ہے برابر
گریباں اب سِلا کر دیکھتے ہیں

بجھے گی آگ پانی سے بھلا کب؟
چلو پھر پی پلا کر دیکھتے ہیں

حسینوں کی فسانہ ساز فطرت
فسانوں میں سجا کر دیکھتے ہیں

قسم بے گانگی کی جس نے کھائی
اسے اپنا بنا کر دیکھتے ہیں

مِری پونجی یہ رُشحاتِ قلم ہیں
جسے سب گُنگنا کر دیکھتے ہیں

دلِ تیرہ میں ثاقب آؤ پھر سے
نئی شمعیں جلا کر دیکھتے ہیں

عباس علی شاہ ثاقب

غزل

کیا مال اور منال محبت کے شہر میں
دل سہہ رہا ہے ، ذہن مگر مانتا نہیں

پھونکے ہیں ماہ و سال محبت کے شہر میں
اہلِ وفا کا قال ، محبت کے شہر میں

آوارگی کو زیست سمجھنے لگا یہاں
پھر صُبحِ نو کی راہ کو روکے ہوئے ہے شَر

خوشبو کے ہم خیال محبت کے شہر میں
آئے کوئی بلال محبت کے شہر میں

ناشفتگی ، ہراس ، ریا ، رہزنی کا راج
انساں دکھائی دیتے ہیں انسان کو یہاں

اے ربِّ ذوالجلال محبت کے شہر میں
دیکھا ہے یہ کمال محبت کے شہر میں

پھرتے ہیں چاک سینہ لیے ، بدحواس سے
محتاجِ اندمال محبت کے شہر میں

ردا حاصل خلوص

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تتلی کے لیے کیا مرے اندر ہمک اُٹھا
اِس عمر میں بچوں کی طرح دوڑ پڑا میں

غزل

میتھو محسن

میری ہستی سنور گئی آخر
اِک نظر کام کر گئی آخر

ہر طرف کتنے ماہ و انجم تھے
آپ ہی پر نظر گئی آخر

جو قیامت گزرنی تھی ہم پر
دل کے ہاتھوں گزر گئی آخر

جو خلش یوں ہی سی تھی پہلے پہل
رگ و پے میں اُتر گئی آخر

سوز دل کا کرشمہ ہے محسن
نیند شب کی کدھر گئی آخر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھیے اب کس ہوا مَیں پنکھ پھیلاتا ہُوں مَیں
کِن دیاروں کی طرف پرواز کر جاتا ہُوں مَیں

غزل

گر تم نے جدا پانی سے پتھر نہیں دیکھا
پھر تم نے کسی خاک کا پیکر نہیں دیکھا

ہم نے تو اسے دیکھا بھی اور چھو بھی لیا ہے
جس شے کو جہاں والوں نے اکثر نہیں دیکھا

دنیا سے نکل جاتا ہوں حیرت کے اثر سے
پھر دیکھنے لگتا ہوں کہ بہتر نہیں دیکھا

جو یاد کے محور میں ہے سب نقش ہے دل پر
ان چھوئی ہوا کہتی ہے پل بھر نہیں دیکھا

جو خواب مرا تکیے کے نیچے سے ملا ہے
ایمان سے کہتا ہوں وہ سو کر نہیں دیکھا

بے پردہ وہ محفل میں نظر آئے تھے سب کو
زاہد نے مگر اس کو سراسر نہیں دیکھا

زاہد خان

غزل

کبھی آنا ، سنا دوں گا تمھیں قصّہ جوانی کا
کہ ایک اِک لفظ تڑپائے گا میری اِس کہانی کا

دوانہ اور آوارہ ہوں کیا لینا ہے دنیا سے
خدا حافظ ہے میرا اور اِس دُنیا دوانی کا

ابھی تک حوصلہ ہارا نہیں ہے لڑتا آیا ہوں
کیا ہے سامنا میں نے بلائے ناگہانی کا

تمھیں برسوں ہوئے دل دے دیا تھا پوچھنا یہ ہے
خدا جانے کیا ہے حال کیسا اس نشانی کا

کبھی اے آرزو دنیا سے دل کا حال مت کہنا
ہنسے گی اور اڑائے گی مذاق اس لنترانی کا

خالق آرزو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک گھر سے اُٹھا ہُوا بگولا
بستی بستی بکھر گیا تھا

غزل

ہے دن کا اجالا یا سیہ رات حقیقت
یا رات میں یہ تاروں کی بارات حقیقت

اس نورِ بلاضد کی عیاں ذات سے پوچھو
انوارِ حقیقت ہیں یا ظلمات حقیقت

بن جاتے ہیں اک آن میں یہ قصۂ ماضی
لگتے ہیں گزرتے ہوئے لمحات حقیقت

ہر شے ہے تری جلوہ نمائی سے فروزاں
معدوم ہیں سب ایک تری ذات حقیقت

باہر ہیں مری قوت ادراک کی حد سے
تو کہتا ہے تو ہونگے وہ باغات حقیقت

باور ہوا جب گردشِ دوراں نے ستایا
تاثیر میں تھیں ماں کی مناجات حقیقت

دیکھو تو بظاہر ہے بہت عام سا انساں
پرکھو تو ہے سیّد کی ہر اک بات حقیقت

حسن پرویز سیّد

غزل

آنکھوں کو فرطِ شوق میں اندھا کیا ہوا
دل کو ترے خیال میں اوندھا کیا ہوا

کیسے چلے یقین کی بگھی خرام سے
شک کی گلی نے بند ہے رستہ کیا ہوا

دینارِ عشق لے کے کریں بھی تو کیا کریں
سر میں سما گیا ترا سودا کیا ہوا

ہم رُک گئے ہیں دیکھنے منظر کی لاش کو
خواہش کو نوکِ تیغ پہ چلتا کیا ہوا

لائیں گے چاند ڈھونڈ کے تاروں کی بھیڑ سے
ہم نے بھی چاندنی سے ہے وعدہ کیا ہوا

سرفراز عارض

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

برق رَو راہ برو! لوگ رہے جاتے ہیں
مگر اے راہ گرو ! فُرصتِ تاخیر کہاں

غزلیں

لگتا تھا جو چھاؤں بھی محبت بھی کرم بھی
رکھا نہیں اس نے مری الفت کا بھرم بھی

میں جس کے لیے آنکھ میں نم لے کے کھڑی ہوں
ہنستے ہوئے دیتا ہے مجھے ہجر کا غم بھی

دنیا کی طرح سوچ رہے ہیں ترے بارے
بیکار میں نفرت کیے جاتے ہیں نہ ہم بھی؟

دیتا ہے خزاں اور بہاریں مرے دل کو
کرتا ہے روا رحم و کرم اور ستم بھی

بچپن ہے مرے سامنے میرا ہی یہاں تو
چہرے پہ ہنسی رکھی ہے آنکھوں میں ہے نم بھی

ہر دور میں معیارِ وفا ٹھہرے ہیں ہم لوگ
دل میں ہے محبت بھی بغاوت کا علم بھی

بس ایک دعا مانگ کے پڑھتی ہوں نمازیں
وہ شخص جدا ہو نہ مرے سینے سے دم بھی

میں بھول نہ پائی تری الفت کے زمانے
تو بھول گیا آج مری زلف کے خم بھی

رخسانہ سمن

آنے جانے کی اذیت سے بچا دے مجھ کو
در سے بہتر ہے کہ دیوار بنا دے مجھ کو

جل رہی ہوں تو اندھیروں کے حوالے کر دے
بجھنے والی ہوں تو سانسوں کی ہوا دے مجھ کو

بس ترے ہاتھ میں رکھی ہے دوائے راحت
آ مرے جسم کو چھو اور بقا دے مجھ کو

میں ترے عکس کی پرچھائی کے پیچھے بھاگی
آئنہ توڑ کے مٹی میں ملا دے مجھ کو

اس سے پہلے کہ مری چاک پہ تصویر بنے
خاک ہوں اور ہواؤں میں اڑا دے مجھ کو

میں سماعت کے دریچوں سے تجھے دیکھتی ہوں
خامشی توڑ، مری جان! صدا دے مجھ کو

غزل

چھا گئی بے رخی کی ادا آپ کی
مار ڈالے گی یہ انتہا آپ کی

ہجر کی شام سے یہ مرے ساتھ ہے
آپ سے تو ہے بہتر جفا آپ کی

تھام لیتا ہوں اب در کو، دیوار کو
جو سہولت نہیں ہم نوا آپ کی

سوچتا ہوں دعا میں اثر کیوں نہیں
دیکھیے لگ گئی بددعا آپ کی

ضبط کی تاب اب لائیے کس طرح
آسماں پر ہے پہنچی انا آپ کی

مسکراہٹ تھی خاموشیوں میں بسی
یاد چلمن ہے وہ بے صدا آپ کی

عبدالرؤف زین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیوں سرِ کہسار آئے
قد بڑھانے اگر آئے ہیں تو بے کار آئے

غزل

شمیلہ سعید

تمہیں دیکھنے کی جو چاہ تھی
وہی خواب تھا ، وہی راہ تھی

مرے ہاتھ کچھ بھی نہ آ سکا
فقط ایک الجھی نگاہ تھی

میں بھٹک رہی ہوں اِدھر اُدھر
کبھی دل میں تیرے پناہ تھی

مری بات سب مرے بے خبر
کبھی پیار تھا ، کبھی چاہ تھی

مرے محترم مرے دلبرا
ترے واسطے میں گناہ تھی

انتخاب
خالد احمد
نعمان منظور

خالد شعور شعر کہاں تھا مجھے ، مگر
اظہار کی خلش تھی کہ شاعر بنا گئی

غزلیں

ہر کسی کے لیے منزل نہیں رستہ ہیں آپ
اور اسی بات کو لے کر سدا تنہا ہیں آپ

خشک ہونٹوں پہ جمی پیاس پہ حیرت ہے مجھے
میں تو یہ سوچ کے آئی ہوں کہ دریا ہیں آپ

کب تلک ہوں گے نہ ظاہر بھلا آثارِ زوال
موسمِ گل ہیں کہ شاداب تمنا ہیں آپ

میں کسی اور ہی رستے پہ چلی جاتی ہوں
جانتی ہوں کہ مرے دکھ سے مبرا ہیں آپ

مجھ کو معلوم ہے کل رات کہاں برسے ہیں
ابرِ امید مری آنکھ کا جلوہ ہیں آپ

یہ وہ جذبہ ہے رویوں سے جھلک جاتا ہے
پیار تو تب ہے کہ ہر سانس کا حصہ ہیں آپ

مسکراہٹ میں جیا کھلتے ہوئے غنچے کی
زخم در زخم کسی درد کا نوحہ ہیں آپ

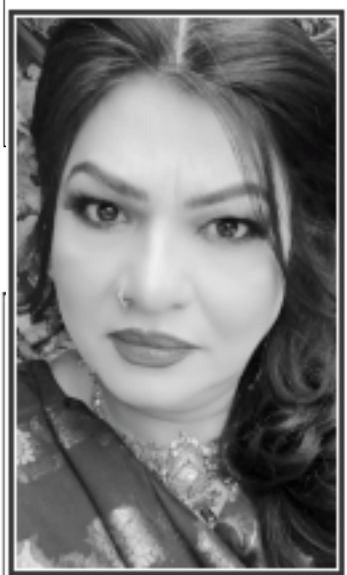

جیا قریشی

دورِ تیرگی کا ہے سب کے واسطے پیغام
''آنسوؤں کو بیچیں اور روشنی کریں نیلام''

کون تیرے بارے میں گفتگو کرے کھل کر؟
کس کو فرصتیں سوچے زندگی ترا انجام!

ہم نے باب الفت پر دستکیں بھلا کب دیں؟
شہر سارا دیتا ہے کس لئے ہمیں الزام

کیوں گلاب شاخوں پر آج دل گرفتہ ہیں
باغ میں ٹہلتا ہے آج کون خوش اندام

کون جان سکتا ہے ہم فراق کے مارے
کس قدر اذیت سے کاٹتے ہیں صبح اور شام

ہم نے گفتگو میں بھی کب پہیلیاں رکھیں
ہم نے اس سخن میں بھی کب جیا رکھا ابہام

غزل

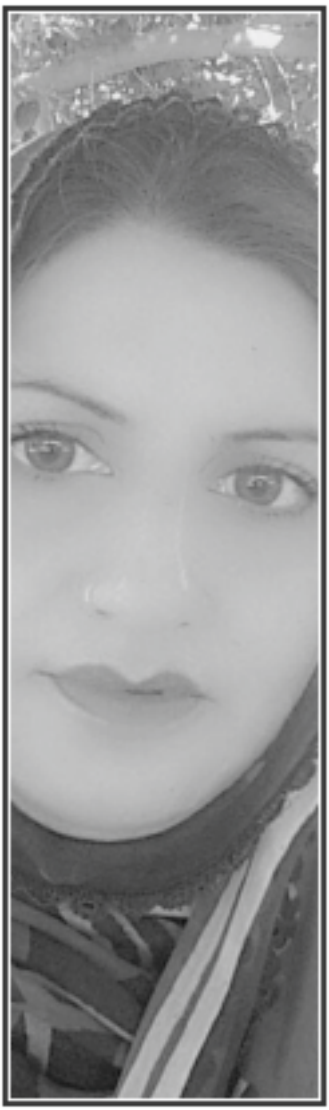

مت پوچھ اس کے قرب میں کیا روشنی سی تھی
دل میں ہر ایک سمت عجب تازگی سی تھی

لوگوں سے اپنے درد چھپانے پڑے مجھے
یہ اور بات آنکھوں میں تھوڑی نمی سی تھی

شب بھر میں سو نہ پائی اسی احتمال میں
ہونٹوں پہ اس کے آج کوئی ان کہی سی تھی

جذبات کے بیان کو الفاظ کم نہ تھے
دھڑکن میں اور بات عجب نغمگی سی تھی

وہ جو کئی برس سے رگ جاں میں ہے مکیں
اس کی ہر اک ادا میں کوئی سادگی سی تھی

کل وہ ملا تو دکھ بھی ہوا اور خوشی حنا
باتوں میں اس کی، اب بھی وہی دلکشی سی تھی

حنا بابر چودھری

غزلیں

مَیں جو خموش ہو گیا
آئنہ رنگ لے اُڑا

بات میں بات آ گئی
ورنہ میں اُس کو یاد تھا!

اپنی طرف بھی دھیان دے
مجھ سے ترا گلہ بجا

قصۂ غم طویل ہے
صبح قریب ہے تو کیا

فرطِ سکوت! احتیاط
کھیل میں ہار جیت کیا!

اچھا بھلا تھا مَیں نوید
وقت نے کیا بنا دیا

یہ جو ہے سب غلط یہاں
سب ہے مرا کیا دھرا

نوید صادق

اُس سے کیا گلہ تو کیا
زخم کوئی چھلا تو کیا

ایک ہی واردات ہے
ایک ہے سلسلہ! تو کیا؟

آئنے سے گریز ہے
پھول کوئی کِھلا تو کیا

بات بھی کر نہیں سکے
باغ میں وہ مِلا تو کیا

مَیں بھی نوؔید تنگ تھا
اُس نے کیا گلہ، تو کیا

چاند اپنا اپنا (طنز و مزاح)

چاند رات پر پھر ہا حشر ہو گا
ہلال کمیٹی کا فیصلہ ہی معتبر ہو گا
لوگ چاند ڈھونڈ رہے ہوں گے
وہ بھی خوف کے مارے اِدھر اُدھر ہو گا

.....

بھئی چاند رات پر میری مثال بھی اس تنخواہ دار شخص کی طرح ہوتی ہے جسے کم آنے پر بھی دوسروں کے حساب کتاب کی فکر ہوتی ہے لیکن جو بھی ہو میں تو سچ ہی بولوں گا۔ اگر بولوں تو لوگ کہتے ہیں کہ آپ بولتے بہت ہیں۔ اگر حقیقت لکھوں تو چڑتے ہیں۔ حق کہوں تو خود غرضی اور نادانی سمجھتے ہیں۔ سوچا کہ کیوں نہ اب جوش کی جگہ ہوش سے کام لیتے ہوئے قلم کو حرکت میں ہی لایا جائے۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میرا ہر شوق نرالا ہے۔ میرے شوق کا عالم کسی دوشیزہ کے پیچھے بالکل بھی نہیں۔ کسی بینک بیلنس یا عہدے کے لیے بالکل بھی نہیں۔ نہ میں کسی پلاٹ، مکان بنگلے، کوٹھی یا گاڑی کا خواہاں ہوں اور نہ ہی میں خواہشات کا ستایا ہوا ہوں۔ ہاں اگر میرے شوق کا عالم ہے تو بس یہی کہ کاش پورے ملک میں ایک ہی دن روزہ اور عید الفطر منائی جائے۔

خیبر پختونخوا والے چاند دیکھنے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں اس لئے بذات خود چاند دیکھنے کا انتظام و اہتمام کرتے ہیں، چاند بس نظر آجائے خواہ کہیں بھی ہو کیوں کہ ان کے مطابق چاند تو چاند ہوتا ہے چاہے کہیں کا بھی ہو لیکن چاند نظر آنا حیات نزع سے زیادہ نازک کام ہے۔ لیکن کمیٹی والے خود چاند نہ دیکھ سکتے ہیں نہ انہیں نظر آتا ہے لیکن کبھی خوش دلی سے عوام الناس کا فیصلہ بھی قبول نہیں کرتے۔ اگر پشاور اور خیبر پختونخوا والوں کو دوسرے صوبوں کے چاند پر اعتراض نہیں تو پھر ان سے بھی اختلاف کی گنجائش نہیں۔

ہلال کمیٹی والے من و عن اپنی من مانی کرتے ہیں۔ کوئی مثبت حکمت عملی وضع نہیں کرتے۔ سالوں سال بیت گئے لیکن یہ مسئلہ چاند دکھائی کا شغل چاند دکھائی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور ہر سال کمیٹی کے دوربین لوگوں کو غمگین کر جاتے ہی اور ان حالات میں جب کسی عام شخص کو چاند نظر آجائے تو ان کی حیثیت ایک دُلہے کی سی ہوتی ہے کہ سب لوگ اُسے داد و تحسین دیتے ہیں۔ شاباش، آفرین کہتے ہیں۔

چاند دیکھنے کے عمل کے لیے لوگوں کا حدود اربعہ صرف پشاور اور خیبر پختونخوا تک ہی رہ گیا ہے

ہمایون خان

کیوں کہ باقی صوبوں میں تو لوگ ہلال کمیٹی کے رحم و کرم پر ہیں، کمیٹی والوں کو چاند نظر نہ آنا ایسا ہی ہے جیسے بیگم کو شوہر کی خوبیاں نظر نہیں آتی ہیں، لیکن اس طرح کی صورتحال میں نظر کی خرابی سے زیادہ حالات واقعات اور ذاتی مفادات کی خرابی نظر آتی ہے۔ ایسی ایسی باتیں سننے کو ملتی ہیں کہ نوکِ قلم پر لاتے ہوئے دل بے اختیار دھڑکنے لگتا ہے۔ بقول شاعر:

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا

.....

ہم نے بھی یہ تلخ تجربہ بذاتِ خود دیکھا ہے کہ آشوبِ چشم میں مبتلا لوگ بھی ہلال کمیٹی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہمارے ایک جاننے والے ہیں پہلے پہل کرکٹ کے امپائر تھے پھر بقول ان کے جب بینائی کم ہوئی تو محکمہ واپڈا سے منسلک ہو گئے اور وہاں بھی ناچار اور بے بس ساس کی طرح خدمات سرانجام دیتے رہے اور آخر کار موصوف واپڈا سے فراغت کے بعد ہلال کمیٹی ممبران کا حصہ بن گئے۔ ہلال کمیٹی میں آتے آتے ان کی بینائی مزید جواب دے گئی تھی لیکن ہلال کمیٹی کو ایسے ہی فرد کی ضرورت تھی اس لیے تو ہمارے اداروں اور محکموں کے لیے لوگ عموماً کہتے ہیں جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔

ہلال کمیٹی والے خود غور کرتے ہیں جو لوگ کمیٹی میں نہ ہوں تو وہ شور کرتے ہیں۔ چاند دکھائی اور چاندرات اسی (غور و شور) کا نام ہے اور اسی غور و شور کی مرہونِ منت کمیٹی چل رہی ہے۔ ایک مشورہ میرا یہ ہے کہ جو لوگ سرمایہ کاری کے لیے پاکستان نہیں آتے تو کم از کم چاندرات کو دیکھنے کے لیے آیا کریں۔ کیوں کہ ہلال کمیٹی کا فیصلہ جو بھی ہو لیکن لطف تو آتا ہے۔

کہتے ہیں کہ آئینے، کیمرے اور دوربین جھوٹ نہیں بولتے لیکن لگتا ہے ہلال کمیٹی کے دوربین کچھ زیادہ ہی جھوٹ بولتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہمدردانہ اور مشفقانہ شعور بھی موجود نہیں ہے۔ ہلال کمیٹی اور چاند دکھائی ایک ایسا معمہ ہے کہ پاکستانی عوام، ہلال کمیٹی اور سیاسی منظرنامے پر سوالیہ نشان ہے۔ اب ان حالات میں چاند بھی شرماتا ہے اور بطورِ خاص پہلی کا چاند تو دُلہن کی طرح شرماتا ہے۔ اب تو لگتا ہے کہ پہلی کا چاند حقیقت میں بروزِ قیامت ہی نظر آئے گا۔ اس لیے تو میں بھی اپنی بیگم سے اس انداز میں گویا ہوتا ہوں:

یہ آرزو ہے کہ سویا رہوں ہزاروں سال
قیامت آئے تو بیگم مجھے جگا دینا

ہمارا ایک دوست اسد عرف مجروح ہلال کمیٹی کے سربراہ بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ بقول ان کے ہلال کمیٹی میں ذمہ داری ہو نہ ہو لیکن پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف اسی خواب کو دیکھنے کے لیے دن رات سوتا رہتا ہے تاکہ خواب دیکھے اور اُسے شرمندۂ تعبیر کرے۔ اگرچہ اس کی شکل ایسی ہے کہ وہ زندگی میں کچھ بن نہیں سکتا لیکن غلط فہمیاں اس طرح پال رہا ہے جس طرح کوئی عاشق ناچار رقیب پالتا ہے یا شوہر اپنے سالے پالتا ہے۔ اور تو اور اب تو بازاروں کے فقیر بھی چاندرات پر

مؤثر انداز میں اپنی صدا بلند کرتا ہے کہ جن کو چاند نظر آیا اُن کا بھی بھلا، جن کو نظر نہ آیا اُن کا بھی بھلا۔

ہلال کمیٹی والے بھی مختلف حیلے بہانے کرتے ہیں۔ کبھی موسمی کیفیات کا بہانہ تو کبھی سالانہ کلینڈر کا بہانہ پیش کیا جاتا ہے۔ اور ان تمام حالات کی آڑ میں شکست و اختلاف کی فضا ہمیشہ عروج پر رہتی ہے اور محاذ اختلاف و مفاد جنگ جاری رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے محکموں کی طرح اب لوگ ہلال کمیٹی کا بھی مذاق اُڑاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک خاتون اپنے روتے بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے گئی اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب میرا بچہ دن رات مسلسل روتا رہتا ہے کسی بھی طرح چُپ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر نے کہا بی بی ہلال کمیٹی کی بڑی بڑی دوربینیں دکھائیں جلد افاقہ ہو جائے گا کیوں کہ ان کے ذریعے چاند نظر آئے نہ آئے لیکن ان کی ڈراؤنی ساخت اور شکل و صورت دیکھ کر بچے بھی حیران رہ جاتے ہیں۔

پہلے زمانے میں لوگ کہتے تھے نیکی کر دریا میں ڈال مگر اب تو یہ سننے میں آتا ہے کہ نیکی کر دُشمنی پال۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ چاند دیکھ لیں یا روزے اور عید کی خبر دیتے ہیں خوامخواہ دُشمنی پال لیتے ہیں۔ بقولِ مشتاق احمد یوسفی شائستہ آدمی وہ ہے جو حالاتِ حاضرہ پر دو منٹ فی البدیہہ گفتگو گالی دیئے بغیر کر سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہلال کمیٹی اور چاند دکھائی کے حوالے سے ہمارے ہاں کوئی شائستہ آدمی موجود نہیں ہے۔

چاند، زمین، سورج اور ان کا گردشی مدار یا پھر عمر کا فرق ممالک کے مابین تو ہو سکتا ہے مگر کسی ایک ہی ملک میں شہروں اور صوبوں کے درمیان نہیں ہو سکتا۔ لیکن تمام تر واضح اور آشکارہ ثبوتوں کے ساتھ بھی چاند رات پر چاند کی ذات کو پہلی فرصت میں قبولیت کی شرف حاصل نہیں ہوتی۔ اگرچہ سائنس اور جدید ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کی ہے کہ انسان نے چاند پر قدم رکھا ہے مگر پہلی کا چاند بروقت اور حسبِ ضرورت کبھی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ شاید کچھ لوگ کمیٹی کی شرافت اور شائستگی کے گرویدہ نہ ہوں کیوں کہ ان کی تکنیکی خامیاں ان کے ماضی کی عکاسی کرتی ہیں۔ کسی بھی صورت اور منصوبہ بندی ہلال کمیٹی والے چاند دیکھ نہیں پاتے تو افسوس صد افسوس ہائے کمیٹی تیرے صدقے جاواں۔ چاند رات ہماری سب خوشیاں اور تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں اور ہلال کمیٹی جیسے تیسے اپنا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ اسی موقعے پر یہ شعر یاد آتا ہے کہ:

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
آخر اس بیماریٔ دِل نے اپنا کام تمام کیا

.....

نجانے کتنی چاند راتوں کا خون ہو چکا ہے۔ نجانے کب کتنی بیویاں چاند رات کی شاپنگ سے محروم رہ چکی ہیں۔ لیکن صاحبِ اقتدار اور صاحبِ استطاعت اداروں اور محکموں کے لیے نہ تو کوئی خطرہ نہ خطرے کی گھنٹی۔ نہ پولیس، نہ فوج نہ کوئی روک ٹھوک، نہ جیل، نہ کوئی وکیل اور نہ ہی عدالتیں۔ اب ہم جیسے بے بس لوگ کریں بھی تو کیا.....؟

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گُل پکار میں چلاؤں ہائے دِل

☆☆☆☆☆

عرب کے بت کدے

عمرو بن لحیّ کا شام سے واپسی کا سے آیا تو مندر کے بڑے پروہت سے بولا، سرکار ہمارے پاس بہت بڑا خدا کا گھر ہے۔ مگر اندر سے خالی ہے۔ دو دروازے لگے ہیں۔ کئی بار اندر گیا ہوں۔ اندر کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی باہر کھڑے ہزار ہا لوگ اُسے سجدہ ٹیک کے اپنی مانگیں مانگتے ہیں۔

تم ہم پہ ایک کرم کر سکتے ہو؟

وہ بولے

بول

یہ کہنے لگا، مجھے اپنے مندر کا ایک بڑا سا بت دے دیں، اُسے میں اپنے کعبے میں لگاؤں گا۔ انھوں نے اُسے ایک بدہیت سا سرخ عقیق کے پتھر کا انسانی شکل میں تراشا ہوا کلڑا دے دیا اس کا دائیاں ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا۔ اور بولے یہ ''ہبل'' ہے۔ اس سے مانگنا۔ اس کے نعرے لگانا۔

جے ہبل

ہبل اب میرا خدا ہے۔

اس نے خدا کو یوں اٹھایا جیسے کوئی بچہ گود لیتا ہے۔

پھر اپنے خدا ''ہبل'' کو اونٹ پہ اوندھا لٹا کے شام سے مکہ میں لے آیا۔ اور خانہ کعبہ کے سامنے اپنی ساری قوم کو اکٹھا کر کے کہنے لگا،

دیکھو۔

تمہارے لیے تمہارا خدا لے کر آیا ہوں۔

یہ ہبل ہے۔

اس کے نعرے لگاؤ۔

کہو، جے ہبل کی۔

لوگ نعرے لگانے لگے۔

بچوں کی طرح انہیں کھلونا مل گیا۔

بچے اس سے کھیلتے رہے، بڑے اس کے آگے ماتھا ٹیکنے لگے۔ اُن سب نے اُسے اٹھا کے خانہ کعبہ کا دروازہ کھول کے اندر سجا دیا۔ خود خانہ خدا کی دہلیز پہ ماتھا رکھ کے بیٹھ گئے۔

''ہبل'' قریش کا سب سے بڑا بت تھا۔ اس کا دائیاں ٹوٹا ہوا پتھر کا ہاتھ قریش والوں نے سونے کا بنوا کے لگا لیا۔ ہبل دراصل بعل کی تحریف ہے۔ ''بعل'' اہل شام کا دیوتا تھا۔ اس سے منسوب بعلبک شام کا قدیمی شہر ہے۔ بعل کے لغوی معنی قوت اور مجاز آقا کے لیے جاتے تھے۔ قرآن میں بعل شوہر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

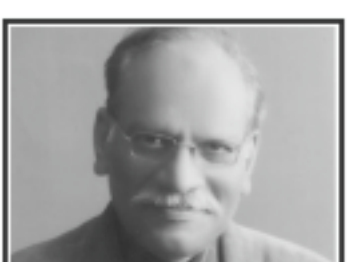

ابدال بیلا

"ہبل" خاص خانہ کعبہ میں نصب تھا۔
ایک پروہت بھی انہیں مل گیا۔ وہ شاید کچھ عرصہ شام میں بت خانوں میں رہ کے بتوں کے نام سے لوگوں کو ڈرانے کے فن سے آگاہ تھا۔ بستی میں کوئی آفت آ جاتی تو وہ لوگوں کو ہبل کی طرف متوجہ کر کے ڈرانے لگتا۔ کہیں لڑائی جھگڑا ہو جاتا، کہتا، آؤ ادھر ہبل فیصلہ کرے گا۔ ہبل کے بہانے اس نے خود سات تیر ہبل کے چرنوں پہ رکھے تھے۔ کچھ پہ لکھا تھا نعم (ہاں)، کچھ پہ لا (نہیں)۔ جیسے سکہ لے کے اس سے ہیڈ اور ٹیل کا ٹاس کرتے ہیں۔ وہ تیروں سے فیصلے کرنے لگا۔ لوگ فیصلہ ماننے لگے۔
خشک سالی کا عرصہ زیادہ ہو جاتا تو وہ شور مچا دیتا، ہبل ناراض ہو گیا۔ لوگ اونٹ، بھیڑیں لا کے اساف اور نائلہ کے پاس ذبح کرنے لگے۔ اس کے ایک بلاوے پہ لوگ ننگے پاؤں گھروں سے دوڑتے آتے۔ شادی بیاہ کی رسومات بھی پروہت نے اچکا لیں۔
لوگوں کو شادی گھر کے لیے جگہ مل گئی۔
پروہت کو خانہ خدا کی دہلیز پہ بیٹھے بیٹھے ایک کاروبار مل گیا۔
موت تک کی رسومات وہیں پروہت کے رُوبرو ہونے لگیں۔ کسی شخص کو کاروبار کے لیے مکہ سے باہر جانا ہوتا تو مشورے کے لیے پروہت کے پاس پہنچ جاتا۔ پروہت ہر فیصلہ تیروں کے بنائے نشانوں سے کرتا۔ کوئی اس کے فیصلے کے آگے چوں چراں نہ کرتا۔ دیکھا دیکھی دوسرے ملکوں کے سفر پہ نکلے لوگ بھی اپنی اپنی پسند کے خدا خرید لائے۔ تھوڑے ہی عرصے میں خدا کا گھر بتوں سے بھر گیا۔
ان کی تعداد تین سو ساٹھ ہو گئی۔
زمین پہ گھومنے پھرنے کے لئے جتنے رُخ ہو سکتے ہیں وہ تین سو ساٹھ ہوتے ہیں۔
انہوں نے ہر رُخ کے لیے ایک خدا رکھ لیا۔
ان کے خداؤں کی شکلیں جدا جدا تھیں۔
اکثر بھدے اور بدشکل خدا تھے۔ کچھ تراشیدہ ہوئے کچھ بے ہنگم ناتراشیدہ لکڑی کے بھی، پتھر کے بھی، ہڈی کے بھی، ہر شے کے خدا انہوں نے خدا کے گھر میں لا کے رکھ دیے۔ ان کی دیکھا دیکھی مکہ کے گردا گرد کی بستیوں والے بھی سوچ میں پڑ گئے کہ ہم کیوں پیچھے رہیں۔ جیسے بچپنے میں بچوں کو کھلونے جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ انسانی تمدن کے اس بچپنے کے دنوں میں سیانی عمر کے لوگوں نے بھی یہ شوق پال لیا۔ اوپر سے چڑھاووں کی آمدنی الگ۔ پھر لوگوں کے اکٹھ کی وجہ سے منڈی کا سا سماں بن جاتا۔
کاروبار میں بڑھاوا آتا۔
بتوں کے لیے تو کسی خاص شکل وصورت کی قید نہیں تھی۔ بس ہر بت کے خدا کا کوئی کہانی کار ہوتا تھا۔ جو اپنے خدا کی کوئی ایسی عجب کہانی بناتا کہ لوگ بھویں اٹھا لیتے۔ گردن ہلانے لگتے۔ جیبوں سے مال نکال کے اُس بت کے

چرنوں میں چڑھاتے اور خود چہرے پہ بیچارگی لا کے اُس بت کے پیروں میں بیٹھ جاتے۔
سبھی بت انسانوں کے خدوخال کے نہیں تھے۔ کچھ کی شبیہیں جانوروں جیسی تھیں۔ کچھ جانور بھی نہ تھے۔ درختوں کا جھنڈ سا تھے۔ مکہ کے پہاڑی مضاف نخلہ کے لوگوں نے بھی سوچا کہ ہم نے بھی بت خانہ بنانا ہے۔ اُن کے ہاں پتھروں سے زیادہ شاید ہریالی قابل قدر تھی۔ انہوں نے تیس بیری کے جھاڑیوں کی کچھ ایسے قطع برید کی کہ انہیں کسی کہانی میں پرو کے خدا کی بیٹی بنا دیا،
نام رکھا ''عزیٰ''۔
ذرا آگے کی خوشحال پہاڑی بستی طائف والے کیسے کسی دیوی کے بغیر رہتے۔ انھوں نے ایک مربع شکل کی چٹان ڈھونڈی۔ اس پہ پوچا کیا۔ اُوپر ایک مافوق الفطرت سا مکان بنا کے اعلان کروا دیا،
خدا کی بڑی بیٹی ''لات''، ادھر رہنے آ گئی ہے۔ آؤ تم لوگ بھی آ کے اس سے ملو اور دلوں کی مُراد پاؤ۔ لوگ اُدھر بھاگنے لگے۔ اُدھر بھی میلا لگنے لگا۔ ''لات'' کا ایک مجاور یاتریوں کو ستو پلایا کرتا تھا، مر گیا تو اس کا بھی بت بنا کے پوجا جانے لگا، وہیں ''لات'' کے پاس۔ اس کا نام تھا ''الات''۔ طائف کے بنو ثقیف لات اور الات کی پوجا کرتے۔ قریش لات اور عزیٰ کی قسمیں کھاتے۔
مکہ سے بحر احمر کی طرف ساحل سمندر پہ قدید کے مقام پہ ''منات'' کی جگہ بن گئی۔
خدا کی تیسری بیٹی ''منات'' کا بھی وُرود کر لیا گیا۔
یثرب کے اُوس اور خزرج کے علاوہ قرب وجوار کے کئی قبائل ''منات'' کی منتیں کرنے لگے۔
خانہ کعبہ کے ہبل اور قرب وجوار کی تین بیٹیوں کے علاوہ پورے عرب میں پھر بتوں کی بہتات ہو گئی۔ ہر خاندان، ہر قبیلہ نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنا خاص بت بنا کے رکھیں جو کسی اور کا نہ ہو۔ سفر پہ ہر شخص جیب میں اپنا ذاتی خدا رکھ کے چلنے پھرنے لگا۔ بڑے بڑے بت خانے پھلتے پھولتے گئے۔
ینبوع کے قریب بنو حلوان نے رباط میں بت ''سواع'' کھڑا کر لیا گیا۔
سواع کی شکل عورت کی تھی۔
بنو ہذیل بن الیاس اُس کے پرستار تھے۔
دومۃ الجندل کے بنو کلب نے ''ود'' کو اپنا دیوتا مان لیا، سجا لیا۔
قریش بھی اسے پوجتے تھے۔ قریش کے مشہور بہادر عمرو بن عبدِ وُد اسی بت کی غلامی کی پہچان تھا جو جنگ خندق میں سیّدنا علیؓ کے ہاتھوں مرا۔
مذحج اور اہل جرش نے یمن میں ''یغوث'' کو اپنا خدا بنا کے بٹھا لیا۔ ''نسر'' حمیر والوں کا دیوتا ہو گیا۔
یمن کا ذی الکلاع قبیلہ اُس کا پجاری تھا۔
''یعوق'' یمن کے علاقے ''ارجب'' کے مقام پہ گڑا ہوا تھا۔
اس کی شکل گھوڑے جیسی تھی۔

بنو ہمدان کی اولاد بنی خولان انہیں اپنا معبود مانتی تھی۔

''عم انس'' بھی خولان قبیلے کے بت تھا۔

وہ کھیتی باڑی اور مال مویشی کے صدقات اللہ اور اس بت کے درمیان کچھ ایسے تقسیم کرتے کہ جو اللہ کا حصہ اس بت کی طرف چلا جاتا اسے نہ نکالتے مگر جو بت کا حصہ اللہ کی طرف چلا جاتا اُسے نکال لیتے۔ وہ تاویل دیتے، اللہ تو بے نیاز ہے، ہمارا بت بے نیاز تھوڑی ہے۔

''سعد'' نامی بت بنی ملکان بن کنانہ کا تھا۔ انہی کی بستی میں کھڑا تھا۔

اس کی شکل بڑی ہیبت ناک تھی۔

لوگ وہاں اپنے جانور ذبح کرتے اور خون اس بت کے منہ پہ مل دیتے۔

ایک آدمی اپنے چند اونٹوں کو اس بت کے پاس برکت حاصل کرنے کے لیے لے گیا۔ ایک اونٹ، اونٹ والے آدمی سے زیادہ عقل والا تھا۔ ہیبت ناک بدشکل بت دیکھ کے وہ اونٹ بدک کے بھاگا۔ وہ آدمی اونٹ کے پیچھے۔ کئی کوس سے جا کے اس نے اونٹ کو پکڑا۔ واپس آ کے اس نے بت کے سر پہ اُٹھا کے پتھر مارا اور گالی دے کے بولا، میرا اونٹ بھگا دیا۔

''الاقیصر'' بھی بت کا نام تھا جو شام کی سرحد کے پاس آباد قضاعہ، لخم، جذام اور غطفان سے نذرانے بٹورتا تھا۔ وہ لوگ ستاروں کی پوجا کرتے تھے۔

کنانہ والے چاند کو پوجتے تھے۔

''ذوالشریٰ'' اور ''خریس'' دیوتاؤں کا جوڑا تھا۔ دوس اور بنی ازد، بنی حرث اور بنی طے کی جدیلہ شاخ عسیر کے علاقے میں انہیں پوجتی تھی۔

''ذوالخلصہ'' کو بھی دوس، خثعم اور بجیلہ کے قبائل اپنا خدا مانتے تھے۔ یہ ''تبالہ'' نامی جگہ پہ ایستادہ تھا۔ اُسے پوجنے والے اس کی توقیر کی خاطر اُسے کعبہ یمانیہ کہتے تھے، اور بیت اللہ کو کعبہ شامیہ۔

''رام'' بنی حمیر اور اہل یمن کا معبد تھا۔

''رضاء'' بنی ربیعہ کا عبادت خانہ تھا۔

''ذوالکعبات'' کو قبیلہ بنو تغلب اور اولاد وائل اور ایاد نے پوجا پاٹ کے لیے ''سناد'' نامی جگہ پہ سجایا ہوا تھا۔

''ذوالکفین'' قبیلہ دوس کا دیوتا تھا۔ سیّدنا طفیل بن عمرو دوسی نے مسلمان ہو کے اس لکڑی کے بنے بت میں آگ بھر کے اسے جلایا تھا۔

بتوں کی پوری فوج تھی۔ جس نے سارا عرب تاراج کیا ہوا تھا۔

اکثر یہ بھی ہوتا کہ لوگ ایک دوسرے سے اپنے خدا بدل لیتے۔

کسی کا بت ٹوٹ جاتا تو روتا پھرتا۔

کہتا ہائے میرا خدا مر گیا ہے۔

مجھے کوئی خدا لا دو۔

خوبصورت پتھروں کی مانگ بڑھ گئی۔

ان کی قیمت چڑھ گئی۔

☆☆☆☆☆

آٹھواں عجوبہ

ہوسکتا ہے کہ وہ دوسروں سے بھی اُسی طرح ہم کلام ہوتا ہو۔

ہوسکتا ہے کہ وہ دوسرے بھی اسکی باتیں اُس طرح سن سکتے ہوں

ہوسکتا ہے کہ دوسرے بھی اُس کی باتیں سن کر اُس کی طرح غور کرتے ہوں۔

ہوسکتا ہے کہ برگد کا وہ پیڑ اُس برسات سے پہلے بھی اتنا ہی بھلا لگتا ہوں۔

ہوسکتا ہے کہ پہلے کی طرح اُس روز بھی، وہ بوڑھے برگد کی باتوں پر دھیان نہیں دیتا اور اُس کے ڈھلے ہوئے پتوں، پتوں کی نکھری ہوئی رنگت اور نئے پھوٹتے ہوئے شگوفوں پر غور نہیں کرتا مگر آج اُس کے پاس کوئی دوسرا کام نہیں تھا۔ وہ گھر سے روٹھ کر برگد کے نیچے آ بیٹھا تھا۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ملگجی روشنی میں وہ وہاں تنہا رہ گیا تھا۔ وہ بارہ تیرہ سال کا اور بلا کا ضدی تھا۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں بوڑھے برگد کی زمین کو چھوتی ہوئی ڈاڑھی عجیب و غریب شکلیں اختیار کرنے لگی تھیں۔ وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود اپنے ضدی پن کی وجہ سے وہاں پڑا ہوا تھا۔ بھوتوں اور چڑیلوں کی سنی ہوئی کہانیاں متشکل ہو رہی تھیں۔ وہم آتش بازی کی ہوائیوں اور چھچھوندروں کی طرح عجیب سا منظر ابھارنے لگا تھا۔ اُسے خود سے زیادہ اپنے گھر والوں پر غصہ آ رہا تھا کہ کوئی بھی اُسے منانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ منائے بغیر گھر لوٹنا اُسے گوارا نہیں تھا۔

گرمیوں میں دن بھر برگد کے سائے تلے میلے کا سا سماں بندھا رہتا تھا۔ جیٹھ کے مہینے میں غیر متوقع بارش کے باوجود سارا دن خوب رونق رہی تھی۔ برگد کے پتوں سے دھول اُتر گئی تھی اور اُن کا ہرا رنگ ابھر آیا تھا۔ قرمزی شگوفے یکا یک پھوٹنے لگے

اسلام عظمی

تھے۔ سب کچھ نیا نیا لگنے لگا تھا' مگر اندھیرا بڑھتے ہی سارے رنگ مرنے لگے تھے۔ کچی زمین پر قطروں کے متواتر ٹپکنے سے بننے والے گڑھے نظروں سے اوجھل ہونے لگے تھے۔ اُس نے بچوں کے رسالوں مریخ کی سطح کی فرضی تصویریں دیکھ رکھی تھی۔ یہ گڑھے ہو بہو اُن تصویروں جیسے تھے۔ ہوا چلنے لگی تو پتوں پر اٹکے ہوئے قطروں کے گرنے کا عمل پھر شروع ہو گیا اور اُس کے کپڑے گیلے ہونے لگے تھے۔

دادیوں اور نانیوں کے مطابق جن اور بھوت جوان سال لڑکیوں اور خوبصورت عورتوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ چڑیلیں اور چھل پائیاں اکیلے مردوں کا تعاقب کرنے لگتی تھیں۔ وہ کم سن تھا اور اُس کی عمر کی کوئی چھل پائی اُسے تنگ کر سکتی تھی۔ یہ خیال اُسے ڈرانے لگا تھا' مگر برگد کے نیچے سے اکا دکا گزرنے والے اُس کا حوصلہ بڑھائے ہوئے تھے۔ وہ کچھ اور دیر کسی منانے والے کا انتظار کر سکتا ہے۔

پھر سردیوں کا موسم دور تھا۔ تب پوہ ماگھ کی کالی سرد راتوں میں دل گردے والے مرد بھی یہاں سے گزرنے سے کترانے لگتے تھے۔ دادیوں اور نانیوں کی کہانیوں کی چھل پائیاں اُنھیں اِدھر آنے سے روک دیتی تھیں۔ اُسے یہاں چھپے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے مگر کوئی چھل پائی دکھائی نہیں دی تھی اور اُسے سنی ہوئی کہانیاں غلط لگنے لگی تھیں کہ برگد کے پیچھے سے.....

.....

وہ دونوں پچھلے چار گھنٹوں سے ہم سفر تھے' مگر انھوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی تھی اور اس دوران میں کوئی اور مسافر ڈبے میں سوار نہیں ہوا تھا۔ دونوں کھڑکی سے باہر جھانکتے جھانکتے بور ہو چکے تھے ایک دوسرے سے ''تہاڈا ناں کی اے'' اور ''تساں کتھے جانا اے'' کی قسم کے سوالات پوچھنے کے بعد اُنھیں حیرانی ہو رہی تھی کہ اُن دونوں کی منزل ایک ہی ہے۔

دانش مند کم و بیش چالیس برسوں کے بعد اُس قصبے کو لوٹ رہا تھا جہاں اُس کا بچپن گزرا تھا۔ اُس گھر میں جہاں وہ پل کر بڑا ہوا تھا اُس کا چچا زاد کریم داد رہ رہا تھا۔ کریم داد کی بیوی سکینہ' دانش مند سے دو تین سال چھوٹی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ کھیلتے ہوئے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ دانش مند کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اجنبی کے کریم داد کے ساتھ کاروباری روابط تھے اور وہ پہلی بار اُسے ملنے کے لیے جا رہا تھا۔ عجیب اتفاق تھا کہ دونوں کی منزل ایک ہی تھی۔

.....

جوں جوں قصبہ نزدیک آ رہا تھا' دانش مند کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُسے اپنے گھر کے سامنے والا برگد کا پیڑ بار بار یاد آنے لگا تھا۔ بچپن میں وہ ایک بار روٹھ کر برگد کے نیچے جا چھپا تھا۔ کیسی ڈراونی رات تھی وہ! دانش مند ایک بار پھر رات کے کچھ گھنٹے برگد کے نیچے گزار کر اُس پرانے تجربے کو دہرانا چاہتا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے دانش مند ساتھی مسافر کو جنوں' بھوتوں' چڑیلوں اور چھل پائیوں کی کہانیاں سناتا رہا تھا مگر اُس نے اِن کہانیوں پر توجہ نہیں دی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اُسے جنوں بھوتوں پر یقین نہیں ہے۔ جبھی تو وہ اُس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دے رہا۔

ہم سفر کی سرد مہری دانش مند کو کھٹکنے لگی تھی۔ وہ مسلسل رکھائی پن کا مظاہرہ کر رہا تھا' مگر دانش مند اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا "کیا آپ واقعتاً مافوق الفطرت کو نہیں مانتے؟"..... دانش مند نے براہ راست سوال کر دیا۔

"کسی چیز کو ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ یقین ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اِس کا تعلق آپ کے اندر سے ہے۔ میرے نزدیک ذاتی مشاہدے کے بغیر تصدیق یا تکذیب کرنا دوسرے کو بھٹکانے کے مترادف ہے۔ کوئی ذاتی تجربہ نہ ہونے کی بنا پر میں آپ کی باتوں کو خوف زدہ ذہن کی اختراع قرار دے سکتا ہوں' مگر آپ کے جذبات کو مدِنظر رکھتے ہوئے چپ ہوں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اِس دور میں' جب مصنوعی سیارچے' ہزاروں میل کی دوری سے تنکے کی تصویر بھی کھینچ جا سکتی ہے' غیر مرئی شے کے ہونے کا ٹھوس ثبوت سامنے کیوں نہیں آیا۔"

"غیر مرئی شے تو ہوتی وہی ہے' جس کا ثبوت نہ ہو۔"

"لیکن بغیر ثبوت کے ماننا کہاں کی دانش مندی ہے! بے ثبوت' آپ کیوں یہ سوچ اپنے ساتھ اُٹھائے پھر رہے ہیں!"..... ہم سفر نے ترت جواب دیا۔

"ثبوت تو بہت ہیں۔ میں ایک دنیا گھوما ہوں۔ ہر جگہ بھوت بابے پائے جاتے ہیں۔ ہر جگہ شیشے کا گولا سامنے رکھ کر آنے والے کل کا احوال بتانے والے موجود ہیں۔ ہر جگہ مافوق الفطرت چیزوں پر یقین رکھنے والے موجود ہیں۔ اِس میں شرق یا غرب کی کوئی قید نہیں ہے۔ میں آپ کو بوڑھے برگد کے نیچے....."..... اجنبی بات کرتے کرتے رُک گیا۔

دانش مند نے ہم سفر کو نیچا دکھانے کی ٹھان۔ وہ تڑپ کا پتا اُس رات کے واقعے کے عینی شاہدوں کی موجودگی میں پھینکنا چاہتا تھا۔ مسلسل بولتے رہنے سے دانش مند کا حلق

خشک ہو کر ڈ کہنے لگا تھا ’’وقت آنے پر ثبوت بھی مل جائے گا۔‘‘

....

سٹیشن کی عمارت سے باہر نکل کر وہ ایک رکشے والے کو ’’اُونچے محلے‘‘ کا بتا کر اُس میں بیٹھ گئے۔ دانش مند کو آج سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا۔ گاؤں سے بڑے شہر میں پہلی بار آنے والے بچے کی طرح اُس نے نظریں اردگرد کی عمارتوں سے نہیں ہٹائیں۔ سب کچھ نیا نیا تھا۔ رستے اور رستوں میں دکھائی دینے والے چہرے بدل چکے تھے۔ جلد ہی اُس نے رستے کا سراغ کھو دیا۔

....

’’اُونچا محلہ تو آ گیا۔ آگے کہاں جانا ہے؟‘‘......رکشا ڈرائیور نے پوچھا۔

’’ہمیں بوڑھے برگد والے اُونچے محلے میں جانا ہے‘‘......اُس نے وضاحت کی۔

’’کون سا برگد!‘‘......ڈرائیور نے حیرانگی سے پوچھا۔

’’قصبے میں ایک ہی تو برگد ہے اور اُس کے سامنے اُونچا محلہ۔‘‘

تب جیسے ڈرائیور کو کچھ یاد آ گیا ’’آپ بہت پُرانی بات کر رہے ہیں۔ بڑی اماں بتایا کرتی تھی کہ یہاں کبھی بوہڑ کا درخت ہوا کرتا تھا۔ یہ میری پیدائش سے بھی پہلے کی بات ہے۔‘‘

دانش مند نے رکشا ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ اُس کی عمر بیس پچیس سال تھی۔ اس لحاظ سے وہ درست کہہ رہا تھا۔ قدرے مایوس ہو کر وہ کہنے لگا:

’’تم نے یہ بھی تو سنا ہو گا کہ برگد کٹنے کے بعد کیا ہوا تھا؟‘‘

’’ہونا کیا تھا! وہاں سے سڑک گزار دی گئی۔ سڑک کے لیے ہی تو اُسے کاٹا گیا تھا۔‘‘

’’برگد کاٹنے والوں کو کچھ نہیں ہوا تھا!‘‘

’’بڑی اماں سے میں اس بارے میں کچھ نہیں سنا‘‘......رکشا ڈرائیور نے سکون سے جواب دیا۔

’’تو ہم یہیں اتر جاتے ہیں۔ خود ہی کریم داد کا گھر ڈھونڈ لیں گے۔‘‘

’’آپ کو کریم داد کے گھر جانا ہے‘‘...... رکشے والا کریم داد کا نام سن کر چہک اُٹھا۔

’’ایسا بولنا تھا۔ اب آپ اطمینان سے بیٹھے رہیں۔ میں آپ کو کریم داد کے گھر کے سامنے لے جاتا ہوں۔‘‘

تھوڑی ہی دیر میں وہ مطلوبہ گھر کے سامنے تھے۔ دروازے پر کریم کے نام کی تختی لگی تھی۔ احتیاط کے طور پر دانش مند نے رکشے والے کو انتظار کا اشارہ کیا۔ اُسے فارغ کرنے سے پہلے وہ گھنٹی بجا کر یہ تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ یہ اُس کے چچازاد کریم داد ہی کا گھر ہے۔

گھنٹی بجانے پر نوکر نے دروازہ کھولا۔ کریم

داؤ گھر پر نہیں تھا۔ تاہم وہ باہر جاتے وقت وہ نوکر کو ایک مہمان کے آنے کے بارے میں بتا کر گیا تھا۔ مگر مہمان دو تھے۔ نوکر نے اندر جا کر اُس نے گھر والوں سے ہدایات لیں اور انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

....

دانش مند کو احساس ہوا کہ وقت نے اُسے بے نام کر دیا ہے۔ وقت کے ساتھ نام اور چہرے اور جڑیں کٹ جانے کے بعد برگد بھی حافظے سے نکل جاتے ہیں۔

’’اندر جا کر بتا دو کہ دانش مند آیا ہے‘‘......اُس نے بے دلی سے نوکر کو بتایا۔ نوکر اندر چلا گیا، پھر کسی نے چیخ کر پوچھا۔

’’تمھیں یقین ہے، تم نے ٹھیک سے سنا ہے مہمان نے نام دانش مند ہی بتایا ہے!‘‘

’’جی ہاں - مہمان نے یہی نام بتایا ہے‘‘......نوکر کا جواب تھا۔

پھر کسی نے چلمن کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔

’’بے بے دانش مند ہی ہے‘‘......جھانکنے والی نے کہا۔ لاٹھی کے سہارے چلتی ہوئی بوڑھی عورت ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ بوڑھی عورت کریم داد کی ماں اور اُس کی چچی تھی۔ دانش مند نے آگے بڑھ کر اُسے سلام کیا۔ اُس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے پہچاننے کی کوشش کی۔

’’سکینہ، دانش مند ہی ہے۔‘‘

وہ دانش مند کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

’’دانش مندا ......تُو ویسے کا ویسا ہے‘‘......سکینہ نے کہا۔

’’مگر اُچا محلہ، پرانا اُچا محلہ نہیں لگا!‘‘......

اُچے محلے کے حوالے سے دانش مند نے بوڑھے برگد کی باتیں شروع کر دیں۔ سکینہ کو کچھ یاد آ گیا۔

’’تمھیں یاد ہے کہ تم ایک روز تم روٹھ کر برگد کے نیچے جا چھپے تھے اور رات ہونے کے باوجود گھر نہیں آ رہے تھے۔‘‘

’’بالکل یاد ہے۔ میں وہ رات کیسے بھول سکتا ہوں! گھپ اندھیرے میں سب کچھ کتنا خوفناک تھا۔ ایک چھل پائی پیچھے سے آ کر مجھے دبوچنے لگی تھی اور میں ڈر کر، میں واپس گھر آ گیا تھا۔ اُس رات کا خیال آتے ہی اب بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔‘‘

....

’’چھل پائی! کون سی چھل پائی۔ بے وقوف، تم ابھی تک یہ سمجھتے ہو کہ کسی چھل پائی نے تمھیں برگد کے نیچے سے بھگایا تھا!‘‘

سکینہ کے لہجے میں حیرت تھی اور وہ دانش مند کو ایسے گھور رہی تھی جیسے وہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہو۔

☆☆☆☆☆

پتھروں کے درمیان

میں نے ابھی چند دن پہلے ہی پرانا محلّہ چھوڑا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں محلّہ بدلنا نہیں چاہتی تھی اس محلے میں میرے پاس دولت اور شہرت بے مقدار تھی اور آپ جانیے ان دونوں شرابوں کا نشہ کہاں کچھ بدلنے دیتا ہے؟ لیکن کسی طاقتور کے حکم پر مجھے ایسا کرنا پڑا تھا، میں نے کوئی جرم بھی نہیں کیا تھا کہ جس کی پاداش میں مجھے اپنا دلربا گھر اور دلدار محلّہ چھوڑنا پڑا، وہ بس ایک حکم تھا اور میں اس حکم کی تابع تھی، لوگوں کا خیال تھا میں نے کسی کی چاہت میں اس کا حکم مانا ہے اور جس کی الفت میں محلّہ بدری لی ہے وہ مجھ سے عشق کرتا ہے اور اس عشق کے ہاتھوں مجھے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے، اگر یہ بات سچ ہے تو اتنی جلیل ہستی کی جانب سے یہ اعزاز میرے لیے بہت ارفع تھا۔ یہ رفعت نہ تو مجھے پدرسری میں ملی تھی ورنہ مادر سری میں، میں ہر قرن میں رہ کر آئی تھی اور سب کچھ جانتی تھی......

بہرحال جس محلے میں، میں حال ہی میں منتقل ہوئی تھی، وہاں میرے بہت سے واقف پہلے سے آباد تھے، ان میں کچھ تو اسی تازہ قرن کے تھے کیونکہ انٹرنیٹ پر واقف ہوتے تھے......البتہ نیٹ پر تو ان کا تعارف بڑا شاندار تھا اور یہاں وہ بڑے واجبی سے رہ رہے تھے......کیا وہ پچھلے محلے میں کوئی بڑا نقصان کر بیٹھے تھے جو آج یوں زبوں تھے؟

میں دیر تک الجھی رہی تھی

محلے کا راؤنڈ لگاتے لگاتے اچانک مجھے پرانے محلے کی ایک معمولی عورت مل گئی جو اپنے گھر میں مسلمان بچوں کو الہامی کتاب

فرخندہ شمیم

پڑھا کر اپنی اور اپنی بے اولاد بیوگی کو پال رہی تھی، جس کا حسن خیرہ کن تھا اور معاشرہ اس کے جمال کو کمال کا جھانسہ دے کر اس کے کواڑ بجاتا رہتا تھا، لیکن وہ بھی کسی دستک کا جواب نہیں دیتی تھی

اس محلے میں وہ کب شفٹ ہوئی اور ایسا کیا ہوا کہ اس کے حالات پلٹے اور وہ کٹیا سے نکل کر ایک شاندار محل میں منتقل ہو گئی۔ میں جاننا چاہتی تھی لیکن اس کے ماہتاب رو کے سامنے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی...... وہ مسکراتی ہوئی اپنے شاندار محل کے اندر چلی گئی...... اور میرے اندر طرح طرح کی بدگمانیوں نے سر اٹھا لیا لیکن یہ بدگمانیاں کسی سحر کی طرح جلد ہی زائل ہو گئیں کیونکہ عورت کے محل میں سے وہی قرأت کی آوازیں آ رہی تھیں جو پچھلے محلے میں اس کی کٹیا سے آتی تھیں... مجھے پورا محل الوہی محسوس ہونے لگا۔ مگر میں شرمساری ہو کر آگے بڑھ گئی۔

محلے میں دور دور تک گھر ہی گھر تھے، کچھ چھوٹے، کچھ بڑے، کوئی یک منزلہ تو کوئی سہ منزلہ بھی، ایک مکان کی نیم پلیٹ تو گھر کے رقبے سے بھی بڑی تھی، سفید سنگ مرمر کا گھر تھا اور بہت خوبصورت، میں اس کے مالک کو جانتی تھی، سابقہ محلے میں بھی وہ بہت پیسے والا تھا اور ہر ہاؤسنگ سوسائٹی میں اس کا ایک گھر تھا... وہ اپنے بھرے پرے اہل وعیال کے ساتھ مختلف گھروں میں سیزن گزارتا اور موسموں سے لطف اندوز ہوتا تھا، لیکن آج یہ اکیلا کیوں ہے؟ اس کے عیال کہاں ہیں؟ دروازے پر کوئی چوکیدار بھی نہیں ہے؟ گھر والوں نے اسے کہیں چھوڑ تو نہیں دیا یا یہ خود سب کو چھوڑ آیا ہے؟

اتنی خاموشی؟

مجھے بہت وحشت ہوئی...... یہ شخص تو ایک جانا مانا اور پردھاک آدمی تھا، ایک دنیا اس کے پیچھے اپنے کاموں کی درخواستیں لیے پھرتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا اس کا سیکرٹری لوگوں کی عرضیاں جمع کرتا جاتا تھا اور خود ہی ان سے جھوٹے وعدے بھی کرتا رہتا تھا...... لیکن آج کوئی سائل اس کے پیچھے نہیں تھا آج تو وہ خود ایک سوالی لگ رہا تھا؟

اچانک مجھے اس خاموش محلے میں شور سنائی دیا بہت سے لوگ ایک گھر کے آس پاس جمع تھے۔ ان کے ساتھ مزدور بھی تھے جن کے ہاتھوں میں بھاری کدالیں تھیں... وہ جو لوگ کدال والوں کو ساتھ لائے تھے باہم بھائی، بھتیجے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ان کا باپ اولاد کے ورثے کی تمام جائیداد لے

کر اس محلے میں آن چھپا ہے اور جواہرات زمین میں دفن کر دیے ہیں..... بیٹے سخت برہم تھے اور مزدوروں کو تیز تیز کدال چلانے کی تلقین کر رہے تھے..... ان کے ہاتھ میں اس گھر کو ڈھانے کا ایک قانونی پرمٹ بھی تھا... لیکن لمبی کوشش کے باوجود بیٹوں کو اس گھر میں سے خاک کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا اور وہ سانپوں کی طرح پھنکارتے ہوئے واپس لوٹ گئے..... میرا چہرہ پسینے سے بھر گیا.. مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ... ان لڑکوں کے باپ نے بیٹوں کو سب کچھ کیسے کرنے دیا، کوئی مزاحمت نہیں کی، اس کے باوجود ایک لڑکے نے کدال باپ کے منہ پر دے ماری جس سے اس کا سفید لباس اور ساکت جسم بھوری مٹی سے اٹ گیا لیکن باپ خاموش رہا... میں دل گرفتہ اپنے گھر لوٹ آئی.....

اگلی شام محلے میں بڑے بڑے بینر دیکھنے کو ملے..... نوجوان رنگین قمقموں اور جھنڈیوں سے ایک گھر کی تزئین کر رہے تھے..... مقدس کتاب کی نقول اس گھر کے اندر رکھ دی گئی تھیں اور لوگ تلاوت کر رہے تھے..... اس گھر کے مکین ایک بہت بڑی اور برگزیدہ ہستی تھے جو اپنے خانوادوں کے ساتھ اس وسیع گھر میں مستقل رہتے تھے.. ان کے اور ان کے خاندان والوں کے پاس بس ایک ایک کمرہ تھا جن کے باہر اگربتی اور لوبان کی خوشبوئیں جلتی رہتی... اس محلے میں ان کی موجودگی باعث رحمت سمجھی جاتی تھی..... میں نے کمال عقیدت سے اس گھر کو دیکھا..... پچھلے محلے میں، میں ایک لکھاری تھی لیکن اب قلم اور قرطاس کی مدت ختم ہو چکی تھی..... اور ذہن واپس لے لیا گیا تھا۔

میں نے ڈبڈبائی نظروں سے اپنی آنکھ کو قلم بنا کر ایک منقبت بزرگوں کے گھر کی بیرونی دیوار پر چھاپ دی اور اپنے گھر لوٹ آئی مجھے اطلاع ملی تھی کہ میرے کچھ رشتے دار میرے لیے دعا کرنے میرے گھر آ رہے ہیں..... پھول ان کے ہاتھ میں ہیں اور عطر بھرے گل پوش انھوں نے راستے سے خریدے ہیں..... مجھے مسرت نے آن گھیرا، میرا گھر میرے پچھلوں کی دعا سے اب پرسکون ہو جائے گا، ورنہ تو کئی گھروں کے اندر من من بھر ماتم سے رونے کی آوازیں میں نے خود سنی تھیں میں نے ایک نگاہ محلے پر ڈالی، ایک سکوت دور دور تک سو رہا تھا..... جسے دیکھ کر..... میں بھی پرسکون ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

کبریٰ

کبریٰ وہی تھی جس کا سائکل ہمیشہ سے خالص کام کرنے والی مائیوں جیسا رہا ہے- اس کے شوہر غفور شادی کے کچھ عرصے بعد ہی سعودی عرب روانہ ہو گئے تھے- کیونکہ وہ کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، خاندان کا رشتہ ہونے کے باعث کبریٰ کے والد نے بہن کی بات نہیں ٹالی تھی- کبریٰ بھی شادی کے کچھ سال بعد جدہ میں رہ کر واپس آ گئی تھی- لیکن شادی کے 28 برس میں سے 16,15 سال تو اُس نے اکیلے ہی بچوں کے ساتھ گزارے غفور چند سالوں کے بعد چکر لگا جاتا تھا-

کبریٰ کو اس کی والدہ کے گھر کے قریب ہی تقریباً 30 گھر کے فاصلے پر سولہ سترہ سال پہلے ایک مکان کا اوپر کا پورشن اتفاقاً مل گیا، اور وہ چھوٹے چھوٹے چار بچوں کے ساتھ وہاں بڑے ہی سیدھے سادے طریقے سے رہنے لگی- معمولی سے کرایے پر ملنے والا یہ مکان تقریباً اُس کی ذاتی ملکیت بن چکا تھا، مالک مکان اور اس کی بیوی کسی دوسرے شہر میں تھے چند برس سے اُن دونوں کے گزر جانے کے بعد اس مکان کی ملکیت کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا تھا- مالک مکان کا لے پالک بیٹا سامنے آنے کے علاوہ پھوپھیاں اور چاچے بھی میدان میں آ گئے تھے- کبریٰ نے اب وہ معمولی سا کرایہ جو وہ دیتی رہی ہے- وہ بھی دینا بند کر دیا تھا-

ایف اے پاس کبریٰ ___ کے گھر میں اپنی شادی کے بعد بھی میرا آنا جانا رہا- وہ کالج کے زمانے سے میری دوست تھی- بی اے میں انگریزی کمپارٹ کے بعد وہ پڑھائی سے بھاگ گئی تھی- شادی کے انتظار تک پھر وہ روز صبح گھر کے سارے بستروں کی چادریں اتار کر دھونے کے ساتھ ساتھ اپنی ماں سے دو دو ہاتھ لے کر سارا دن گزار دیتی تھی- اس کی شادی دیر سے ہوئی اس پریشر اور چڑ کے باعث وہ اپنے ماما باپ کے اکٹھے ایک کمرے میں سو جانے پر بھی بسا اوقات انتقاماً ماں سے لڑتی تھی-

اس نے بچے گورنمنٹ سکولوں میں پڑھا کر بڑے کیے لیکن اب اُس کا دوسرے نمبر کا بیٹا سنی بی سی ایس کرنے کے بعد قالینوں کے ایک بڑے برینڈ کے ساتھ منسلک تھا اور ان کا ڈیٹا مینیجر کا کام کر رہا تھا-

انھوں نے قسطوں پر گاڑی نکلوالی تھی- اور

رخشندہ نوید

یکدم اُس کے گھر میں خوشگوار تبدیلیوں کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی۔

میں چند مہینوں میں دو ایک بار گزرتے گزرتے اُس کے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ میری بیٹیوں کی اُس کی بیٹیوں سے دوستی تھی لیکن میرے گھر کا ماحول تھوڑا مختلف اور شاید بہتر تھا۔ میری بیٹیاں ان سے گھر کے بچوں اور کبریٰ خالہ کے سٹائل کو پینڈو مانتی تھی۔ خاص طور پر صحن میں رکھے گندے گندے پانی کے بھرے برتن، باتھ روم میں پلاسٹک کی میل بھری بالٹیاں___ اُن سے اُنھیں مری بیٹیوں کو خاص اُلجھن ہوتی تھی۔ غفور بھائی جب بھی آتے نئے سٹیل کے حمام، آٹے چاول کی پیٹیاں___ سال سال بھر کا راشن اور اپنی طرف سے جو جو اصلاحات کر سکتے تھے کر کے جایا کرتے!

کبریٰ کی بھی عجیب وغریب شخصیت تھی___ میری اُس سے دوستی بہرحال کبھی ختم نہ ہو سکی کیونکہ میں اپنی عادت کے باعث کسی کے ذاتی معاملے میں کبھی نہیں پڑتی تھی۔ ہاں اگر کسی کو سمجھانا بجھانا ہو تو وہ میں اپنی سوجھ اور بساط سے کر دیتی تھی۔

جب کبریٰ نے اپنے بڑے بیٹے طوسی کو خراب کر لیا تب مجھے پتہ چلا کہ کبریٰ کی جہالت کا پہلا نشانہ اُس کا اپنا ہی بیٹا بن گیا۔ باپ سے چوری بیٹے کو عیاشی کی طرف مائل کرتے ہوئے شاید اس کے وہم میں بھی نہیں تھا___ کہ اس سب کا انجام یہ ہوگا کہ طوسی کے لیے مینٹل ہاسپٹل کے ڈاکٹروں سے رجوع کرنا پڑے گا۔

میں کچھ ایسی بھی اُس کے گھر کے معاملات سے آگاہ نہیں تھی۔ بہرحال مجھے پتہ چلا کہ طوسی کو رات گئے لڑکے بُلا کر لے جاتے ہیں اور اُس کے کمرے میں نشہ آور سگریٹوں کا ڈھیر لگا ہوتا ہے۔ نہایت خوبصورت دراز قد گورے چٹے طوسی نے پڑھائی سے ہاتھ کھینچ لیا اور امیر ہونے کے خواب دیکھنے لگا۔ ماں نے اُس کے کمرے میں ہزاروں روپیہ خرچ کر کے اچھا ماحول میسر کر دیا کہ وہ پڑھنے کی طرف واپس آئے، پورے گھر میں یہ کمرہ الگ ہی ہو گیا جہاں کمپیوٹر، قالین، سٹڈی ٹیبل اعلیٰ بیڈ رکھا گیا۔

لیکن ٹیرس کی طرف کمرہ ہونے کے باعث رات گئے لڑکے طوسی کو سیٹی بجا کر متوجہ کرتے۔ اور پھر طوسی کی لڑکیوں جیسی خوبصورتی اور گوری چٹی رنگت گویا___ اُس کا عیب بن گئی۔

ماں کو تھوڑا بہت لڑکے کے بگڑنے کا علم ہوا، تو ساری مراعات اور رعایتیں یکدم واپس لے لیں۔ اُس پر حد کی سختی کی اُس کو لعن طعن، چھاڑ جھپٹ سے بے بس کر کے رکھ دیا۔

باپ کو وہاں تب خبر لگی___ جب بیٹے نے خودکشی کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور اپنے کمرے میں بند ہو کر وہ صرف نمازوں تک محدود ہو گیا اُس کی زندگی تضادات کی نذر ہو گئی۔ اُس کے کمرے کا کمپیوٹر_ اور دیگر آسائشیں_ سب کچھ اُس کے کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ کبریٰ نے اپنی طرف سے اس سے بدلہ لیا کہ تم نے مری دی گئی مراعات کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے تک اُس کا گھر میری بیٹی کے کالج کے راستے میں تھا، تو میں دو چار مہینوں میں کبریٰ سے ملنے چلی جاتی تھی- چائے وغیرہ پی کر گپیں مار کر اُٹھ جاتی___

میرے شوہر نے عرصہ دراز پہلے جو پلاٹ لیا تھا اُس کی قیمت اتنی بڑھ گئی کہ ہم نے فوراً اُسے بیچ دیا- اور اُسی پوش علاقے میں بنا بنایا گھر خرید لیا- اب کبریٰ سے ملاقات کے لیے مجھے بہت دور جانا ہوتا تھا- اب میرے بازار اور شاپنگ کے مقامات بھی میرے گھر کے قریب تھے- کبریٰ سے ملاقات ہوئے کم از کم دو سال ہو گئے تھے- میں نے اپنی بیٹی کی شادی طے کی تو کارڈ لے کر کبریٰ کی سیڑھیاں چڑھی-

دروازہ کھلتے ہی میں نے کبریٰ کے چہرے کی پیلاہٹ کی جگہ ایک لالی دیکھی_ اور اُس کا لباس بھی معقول اور صاف ستھرا تھا- سردی کا موسم تھا اس نے خاصی مہنگی چادر اوڑھے ہوئے تھی، یہ وہی کبریٰ تھی جس نے برآمدہ کور کر کے جالی لگائی ہوئی تھی- اور وہاں زمین پر صفیں بچھا کر یہ لوگ ہوا کا لطف لیتے تھے- اس روز وہاں قالین صوفے، میز پڑا تھا_ اور برامدہ بھی باقاعدہ مٹی ڈرائنگ روم بن چکا تھا-

اندر اصلی والا ڈرائنگ روم، یعنی گھر کا بڑا کمرہ _ جہاں کبریٰ نے ہمیشہ پلنگ بچھا کر رکھے، ساتھ ہی ایک آدھ صوفہ پڑا ہوتا تھا جسے ڈرائنگ روم کا نام دیا جاتا تھا وہ بھی___ اب باقاعدہ ڈرائنگ روم میں ڈھل چکا تھا-

میرے بیٹھے بیٹھے کبریٰ کی چھوٹی بیٹی فاطمہ جو کہ اب ایک مہنگے پرائیویٹ ادارے میں اعلیٰ ڈگری لینے کے لیے پڑھ رہی تھی- اپنی چھوٹی بہن صاعقہ کو دفتر سے لے کر لوٹی تھی-

دو سال کے اس عرصے میں ان بچوں میں آنے والی نئی چال ڈھال کی حیرت انگیز تبدیلی، فاطمہ اور صاعقہ کے ڈائی شدہ بال- صاعقہ کی جینز کے ساتھ اونچی شرٹ، ہلکے ہلکے میک اپ میں اب وہ بڑی مارڈن سی لڑکی لگ رہی تھی-

میں نے دیکھا کہ ان کی چال ڈھال کے ساتھ ان کا تو بول چال کا انداز بھی بدل گیا ہے- منہ ٹیڑھا کر کر کے انگریزی بولنے والی دونوں فاطمہ اور صاعقہ کی بات میں شیخی اور چھچھورا پن سرایت کر چکا تھا-

غفور بھائی پچھلے کئی سال سے پاکستان آنا آنا کر رہے تھے مگر اُن کے ویزے کے مسائل نے انھیں وہاں باندھا ہوا تھا- میں نے سوچا غفور بھائی نے خوب کمانا شروع کر دیا ہے- جدہ میں کھجوروں کا کاروبار لگتا ہے خوب چل نکلا ہے- یا پھر اُس کے بیٹے سنی کو قالینوں کی کمپنی والوں نے اتنا نواز دیا ہے- ویسے تو کبریٰ کو کمیٹیاں ڈالنے کا شوق بھی رہا ہے- ہو سکتا ہے، بچے بڑے ہونے پر اپنی ساری اگلی پچھلی جمع پونجی کبریٰ نے باہر نکال لی ہو اور بچوں پر نچھاور کرنی شروع کر دی ہو-

میں نے شادی کا کارڈ دیا، اُس کی ہر چیز کی تعریف کی، پورے گھر میں پھری_ بلکہ اُس نے خود بہت سی نئی چیزیں مجھے دکھائیں- میں خوش ہوتی رہی- آج اُس نے میری خاطر کے لیے فاطمہ کو 1000 کا نوٹ دیا جاؤ___ سوی خالہ نے جو کھانا

ہے چائے کے ساتھ لے آؤ- اور وہ واقعی ایک بڑی بیکری سے ڈھیروں چیزیں لے آئی-

سب سے مزے کی بات کبریٰ کی باتوں کا محور مکان، گھر، نیا گھر، گروی پر گھر، گھر بنوانے یا اس سے متعلقہ موضوعات تھے۔ وہ مجھ سے مشورے لیتی رہی کہ کہاں پیسہ انویسٹ کرنا چاہئے__ میرے بیٹھے بیٹھے اس کا چھوٹا بیٹا بھی گھر لوٹ آیا تھا- اُس کے ہاتھ میں موبائل امپورٹڈ تھا، لیپ ٹاپ اٹھائے اس کے ساتھ ایک ننھا سا اسسٹنٹ بچہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا-

میں نے آتے آتے کبریٰ کو شادی پر آنے کی تاکید کی اور ہولے سے پوچھا_ کیا کوئی لاٹری وغیرہ نکل آئی ہے؟ وہ کھل کر ہنسی__ خوشی اور مسرت اس کی نس نس سے پھوٹ رہی ہے- اُس نے صرف ایک جملہ بولا__ ''تجھے پتہ ہے میں ہمیشہ سے کتنی اللہ والی ہوں'' اللہ مددگار ہے__ مدد کے لیے فرشتے بھی پیدا کر دیتا ہے'

میں کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے بغیر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی لیکن یہ بات تو یقینی تھی کہ- ایک دو سال کا عرصہ اتنا طویل نہیں ہوتا کہ اتنی بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ بن جائے- بجز دو تین صورتوں کے، کہ آپ کا بانڈ یا لاٹری نکل آئے- سٹاک کے بزنس میں بڑا ہاتھ پڑ جائے، کمیٹی بھی آپ کتنی بڑی ڈال سکتے ہیں- غفور بھائی کو__ بزنس میں فائدہ وہ بھی بے پناہ ہو گیا ہو-

بہرحال کبریٰ کے گھریلو حالات میں فی الفور آجانے والا خوشگوار تغیر میرے لئے تو کیا اردگرد رہنے والوں اور میل جول والوں کے لیے بھی حیرت ناک تھا-

اسی سوچ میں سارا راستہ مری آنکھوں میں وہ منظر گھومتا رہا جب میرے بیٹھے بیٹھے ہی کبریٰ کے سارے بچے دوسرے کمرے میں کمپیوٹر پر بیٹھ گئے- اور بار بار ماں کو بلا کر لے جاتے رہے- ویب کیمرہ آن لگ رہا تھا- میں تو یہی سمجھی کہ غفور بھائی ہیں- بلکہ ہنسنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں- لیکن وہ غفور کی نہیں تھیں- دو بار کبریٰ بھی کمپیوٹر والے کمرے میں گئی اور بڑی خوش خوش ہنستی کھیلتی باہر آئی- بہرحال نہ تو میں نے کچھ پوچھا_ نہ اُس نے کچھ بتایا_ میں دوستی میں بڑی محتاط رہنے کے حق میں رہی ہوں_ دوستوں کی ذاتی زندگی میں دخل دینے میں احتیاط لازم ہے_ ہاں رشتہ دار وغیرہ__ جن کا جائیداد بانٹنے کا ارادہ ہوتا ہے__ وہ سیاسی طور طریقوں سے تاک جھانک کریں تو شاید جائز ہو-

بہرحال اس روز دوسرے کمرے میں ہونے والی باتیں حیران کن تھیں کبریٰ کا چھوٹا بیٹا سیدھا سادہ بچہ سنی جس نے 4 سال میں ختم ہونے والا BSC صرف دو سال میں ختم کر لیا تھا اور جس کی ڈگری بھی مارکیٹ میں وقعت نہ رکھتی تھی- دیکھنا یہ تھا کہ اس نے کیسے اتنا زیادہ کما لیا تھا- کبریٰ بتا رہی تھی کہ وہ کمپیوٹر کی سائٹ سے پروگرام اُٹھاتا اور ویب سائٹ بناتا ہے اور ڈالرز میں روپیہ کماتا ہے- اس کے ساتھ ساتھ جو اس نے راز کھولا کہ اُس کا افریقہ میں کوئی دوست بن گیا ہے- یہ معاملہ تو مجھے ورطہ حیرت میں ڈال گیا

شاید وہ دوست کوئی بلیک نیگر تھا افریقہ کے کسی علاقے میں رہتا تھا اور جس کے ساتھ مل کر سنی بزنس کرنے لگا تھا۔ کبھی ٹوکری بھر کر موبائل سیٹ آتے جنھیں سنی نے یہاں بیچ کر منافع کمایا۔ لیپ ٹاپ کی کھیپ آگئی وہ اپنے دوستوں میں، دفتر وغیرہ میں بڑے مہنگے بک گئے امپورٹڈ جوتیوں کی لاٹ بھی آئی۔ کبریٰ اس سب معاملے کو اللہ کی رحمت سے تعبیر کر رہی تھی۔ کہ چھپّر پھٹ چکا ہے۔ وہ کالو کبریٰ کے بقول رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا تھا۔

میں شادی کا کارڈ تھام کر اپنے لیے بھی کسی چھپّر کے پھٹنے کی دعا مانگتے ہوئے اس کی سیڑھیاں اُتر آئی۔ شانا مری بیٹی کی شادی کی تاریخ تک دوسرے بکھیروں اور کاموں کے ساتھ ساتھ مجھے کبریٰ کا گھرانہ یاد آتا رہا۔ اور ان کے حالات کی دن دگنی رات چوگنی ترقی پر انجانے میں حسد کر رہی تھی۔

شادی کے تینوں دن ___ کبریٰ کے زیورات اور اس کی دونوں بیٹیوں کے لباس اور فیشن دیکھ دیکھ کر آنکھیں دنگ رہ گئیں۔ میں نے بہرحال تعریفیں کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ شادی کے ایک دن اُس کے ساتھ طوبیٰ بھی تھا جو اب بہتر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں ایک ساکت احساس میں نے محسوس کر لیا تھا۔ ہونٹوں پر کالے رنگ کی پپڑی بتا رہی تھی کہ وہ پھر سے بے تحاشہ سگریٹ پی رہا ہے۔ شانا کی شادی کے بعد کافی عرصہ تک میں پھر کبریٰ سے نہ مل سکی۔ فاصلوں کے زیادہ ہو جانے کے باعث اور اپنی دوسری بیٹی کو یونیورسٹی لانے لے جانے کی ڈیوٹی۔ اور اس سے بڑھکر اس کی شادی کی فکر۔ ان ہی بکھیروں میں ایک روز کبریٰ کا فون آیا کہ اس کی بیٹی فاطمہ یعنی بڑی بیٹی کی رخصتی ہے۔ فون پر نکاح ہو چکا ہے۔ اور اب وہ نائیجیریا جا رہی ہے۔ مرے اوپر نیچے کے سوالات پر کبریٰ ہنستی جا رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی اللہ نے بہت اعلیٰ سبب بنا دیا ہے۔ یہ وہی فرشتہ ہے۔ جس کے ساتھ سنی بزنس بھی کرتا رہا ہے۔ فاطمہ سے انٹرنیٹ پر ملاقات ہوئی تھی اس کی۔ دو چار سال پہلے۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ بہت خوش رہے گی فاطمہ۔ سنی بھی ساتھ جا رہا ہے اسے چھوڑنے۔ نکاح تو فون پر ہو گیا تھا، اس کی باتیں سن کر میں نے اپنی آواز کی حیرت پر قابو پاتے ہوئے رُک رُک کر کہا،

چلو بہت مبارک۔ ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ اچھا کبریٰ سن مجھے تصویر تو بھیج دے لڑکے کی۔ میں بچوں کے ساتھ ریسپشن پر ضرور آؤں گی۔

فون بند کرتے ہی کبریٰ نے وٹس ایپ پر مجھے دو تصویریں بھیج دیں۔

فاطمہ سے دگنی عمر کا ایک فربہ، پستہ قد انسان۔ جس کا فاطمہ سے کسی بھی قسم کا کوئی بھی میچ نہیں تھا۔

میں نے ذہن کو جھٹکتے ہوئے سوچا۔ میں کون ہوں۔ ان کے معاملات میں دخل دینے والی۔ ان کی رضا ان کی مرضی۔ ان سب نے کچھ دیکھا ہی ہوگا۔ لیکن میری بے چینی ختم نہ ہوئی تھی اور میں کئی دن تک کبریٰ کی عقل پر اور حیران و پریشان پھرتی رہی۔

☆☆☆☆☆

میری باتیں [بانگیرو گلشن]

آج میں نے اپنا قیمتی اثاثہ جلا دیا-
ابریشم جیسے دنوں کو زہریلی دھوپ بھری دوپہر میں نذرِ آتش کر دیا- خاکستر کر دیا- سارے سنہرے روپہلے سے میں تم ہی میرے ساتھ رہے سنہرے روپہلے ہی نہیں بیتالے کالے سے میں بھی-- میں جھگڑتی بھی رہی اوقات سے بڑھ کر بول گئی چیونٹی کے سر پہ شبنم کا پھا گرے تو اسے لگتا آسمان گر گیا
میں نے یہ جانا ہے انسان کی سوچوں میں سے اگر انسان کو منہا کر دیا کر دیا جائے تو جو باقی بچے گی وہ جنت ہے
زندگی ایسی ہی ہوتی ہے سب کی کہ مسائل قطار باندھے کھڑے ہیں ان کے حل کرنے کا وسیلہ ہاتھ لگتا نہیں مگر سپنے ہیں کہ تہہ در تہہ بچھے جاتے ہیں پہلا دوسرا زینہ بنتا نہیں چھت پہلے تیار ہو جاتی
ہاں مگر ماضی میں گھٹن کے تار و پود میں کوئی سبز بیل لپٹی رہتی تھی اس کی شناخت بڑی دیر بعد ہوئی--- سمجھوتہ ہوئی
زندگی ایسی بھی کوئی ناقابل پیشگوئی نہیں-
ترتیب ایک ہے ترتیب میں کھڑے بے ترتیب-
منتشر الخیال بے چین اور محبتوں کے مجرم لوگ-- محبتوں کے جکڑے ہمیشہ غمزدہ کمزور خوفزدہ ہوتے ہیں
ایک اور بات بھی مان لیجیے ماضی کے کیل ٹھونک کر سیل بند کر دیے گئے دروازے سے ہم کسی ٹائم مشین یا سامان نقب کے بغیر چھلانگ لگا کر اپنا جیا جیون پھر جی سکتے ہیں کسی مونجھ کی چارپائی پہ بیٹھ کر ہمدموں سے آزاد قبر نشینوں کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر قہقہے لگا سکتے ہیں ان کے کاندھے پہ سر رکھ کر راز و نیاز کی سرگوشیاں کر سکتے ہیں
ہاں البتہ ہوشیار خبردار زمانہ حاضر اسے اپنے پیمانے سے ناپے گا یہ پارکنسن الزائمر کا روگی قرار دے دے گا
اور سوچو تو-- یہ بات بھی ہے یوں گزشتہ کی طرف لپک لپک کے جانا کیا دانشمندی ہے؟
جب زمانہ گزشتہ موجودہ تھا تو کیا دل آسودہ تھا؟ یہ لپک کہیں ابلیسی مکر تو نہیں طاغوتی حربہ تو نہیں عمر رائیگاں کرنے کا ڈھکوسلہ تو نہیں-
آدمی کا جسم کیا ہے جس پہ شیدا ہے جہاں--
آدمی کی عقل وہ ہے جس پہ شیدا ہو جہاں---

☆☆☆☆☆

دردانہ نوشین خان

''اللہ کی دین''

درد کی شاخوں پر پھر سے
زخموں کے پھول مہکتے ہیں

.....

کون ہے جو اِن کی خوشبو سے فیض یاب ہونا چاہے۔ درد کی شاخیں جو ہوا کی تیزی سے اُمڈ اُمڈ کر اُبھر اُبھر کر اُس کی خستہ کھڑکیوں سے ٹکراتی رہیں۔ مدتوں پرانے شیشے آپس میں کسی گھنٹی کی طرح بجتے اور اِک پراسرار سا شور اُس کی جھکی ہوئی چھت والے کمرے میں بھی جاتا جہاں وہ اکیلا ہی حالات کی سنگینی سے نبرد آزما تھا۔ بل ادا نہ کرنے کی وجہ سے بجلی کٹ چکی تھی۔ اب ایک ننھا سا موم بتی کا شعلہ اِس مہیب تاریکی کو سمیٹنے کی سعی ناکام میں مبتلا تھا۔ کھڑکی کے ٹوٹے کسی بھی کواڑ سے ہوا کا ایک وحشی جھونکا ٹکراتا تو یہ ننھا سا کمزور شعلہ کانپ کر رہ جاتا۔ کمرے میں اور کوئی مناسب جگہ بھی نہیں تھی جہاں یہ شعلہ محفوظ رہ سکتا۔ وہ کسی آن میں دم توڑ سکتا تھا۔ اور اِس سے زیادہ خستہ حال اور بے جان وہ شخص تھا جو خود اپنی زندگی کا دیا جلائے رکھنے میں بے طرح مصروف تھا۔ مگر درد کہ ہر آن بڑھتا تھا۔

کسی ناکردہ جرم کا سزاوار تھا کہ سزا ختم ہونے کو ہی نہیں آتی تھی۔ بن بلائی وحشتوں میں گھرا، سوچوں کے گرداب میں ڈوبتا اُبھرتا، ہاتھ پاؤں مارتا تھا۔ کوئی تو ہو جو اُسے زندگی کی راہ پر ڈال دے۔ زندگی لمحہ لمحہ درد میں غرق ہوتی جاتی تھی۔ باہر وحشی موسم اُس کے اکلوتے کمرے کے اِردگرد اپنے وحشی رقص میں مگن تھا۔ اُسے کب پروا تھی کہ ٹوٹے پھوٹے گھونسلے کا واحد مکین اپنی بیماری اور حالات کے بوجھ تلے دبا کراہتا تھا۔ کا زوہ زندگی سے بے نیاز ہو سکتا!! مگر نہیں۔ اُسے یہ وزنی گاڑی اپنے زخمی ہاتھوں سے کھینچنی تھی۔ ہر لمحہ تڑپ تڑپ کر گذرتا اور اُس کے بدن میں اِک چیخ بن کر اُتر جاتا۔

آسناتھ کنول

ایک گھور تاریکی نے چاروں جانب عفریت پھیلا رکھا تھا۔ وہ تاریکی کے اِس پنجہ استبداد سے نکلنا چاہتا تھا مگر نکل کر کہاں جاتا۔ باہر موسم کی وحشتیں عروج پر تھیں۔ اور اندر درد اور گھٹن جان لیوا تھی۔ یا میرے مولا سویرا کب ہوگا؟ کب روشنی کا مسافر میرے گھر میں اُترے گا اور مجھے تسلی دے گا۔ ہاتھوں کے درد سے ادھ موا ہوتا وہ اِک خستہ لحاف میں دبکا رہا۔ آنسو اُس کے پھٹے ہوئے دامن کا نوالہ بنتے رہے۔ کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا سوائے پانی کے جس کا ایک جگ وہ ہمسایوں کے گھر سے بھر کر لایا تھا۔ وقفوں وقفوں سے وہ اُسے پی کر اپنے سینے اور پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرتا۔ بادل زور سے گرجا۔ بجلی کی چمک اُس کے کمرے کے اندر تک اُتر آئی وہ سہم کر دیوار سے جا لگا۔ یا اللہ خیر، یا ربّ میری فریاد بھی سُن لے۔ اپنے بندے کے زخموں کا چارا کر۔ میں یہاں لاوارث مر بھی جاؤں تو کون مجھے سنبھالے گا۔ گھر والوں کے لیے مجھے زحمت نہ بننے دینا۔ اُن کی اُمید مجھ سے اور میری اُمید تجھ سے ہے۔ یا میرے مولا! میرے دل کی پُکار کو سُن لے۔ وہ بلکنے لگا۔ وہ جسے یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ خدا بھی ہوتا ہے۔ اب اُسی خدا سے مدد کی فریاد کر رہا تھا۔ غربت کی داستان دہرائی نہ جائے مولا! روتے روتے نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ اچانک ہی آنکھ کھلی تو سورج کی روشنی پوری آب وتاب سے اُس کے چھوٹے سے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اُسے گوناخوشی ہوئی۔ جیسے زخموں کی ٹیس کم لگ رہی تھی۔ وہ اُٹھا پانی پیا۔ اُسی کے چھینٹے منہ پر ڈالے۔ پیروں میں چپل گھسیڑے باہر کو لپکا۔ شاید کوئی مزدوری مل جائے۔ وہ فٹ پاتھ کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا دکان کے تھڑے کے پاس جا بیٹھا۔ یہاں اور بھی لوگ اپنے ڈبے اور مزدوری کا سامان رکھے انتظار میں تھے کہ کوئی اُنھیں کام کے لیے لے جائے۔ پچھلے دو دن کی بھوک کی وجہ سے چکر بھی آ رہے تھے۔ دو دن پہلے اینٹیں اُٹھاتے ہاتھ بھی زخمی تھے۔ کوئی مزدوری پر لے جائے یا خدا آج تو مجھ کافر گنہگار کی بھی سُن کے۔ مجھے مزدوری مل جائے۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑا رہا تھا۔ سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا اچانک ہی ایک ویگن آ کر رُکی۔ آ جاؤ بھئی سارے کافی کام ہے۔ سب بھاگ بھاگ کر ویگن میں گھس گئے۔ کسی نے اُس کو گھسنے ہی نہ دیا۔ وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

ویگن بھر گئی تھی۔ سب نے حقارت سے اُسے دیکھا تو اپنے ہی اندر بار دیگر ٹوٹ

پھوٹ گیا- تمھیں کام نہیں چاہیے؟ اچانک ایک نسوانی آواز اُس کے قریب سے آئی- سیاہ کرولا میں اِک عورت اُس سے پوچھ رہی تھی- کسی بڑے گھر کی بیگم صاحبہ- وہ بھاگ کر اُس کے قریب پہنچا- سلام بیگم صاحبہ! کام چاہیے- بیگم صاحبہ نے اُس کی آنکھوں کی بے چارگی پڑھ لی تھی- بظاہر جوان آدمی مگر حالات کا مارا ہوا خستہ حال- یقیناً یہ دل لگا کر کام کرے گا- وہ ایک کاروباری عورت تھی اور خوب سمجھتی تھی- چہرہ شناس تھی- ویگن میں بیٹھ جاؤ- جگہ نہیں رہی- وہ گڑگڑایا- چلو گاڑی میں بیٹھ جاؤ- اُس نے اگلا دروازہ کھول دیا- پہلے تو وہ جھجکا- وہ اتنا خستہ حال پھٹے ہوئے کپڑے اور اِس شاہانہ گاڑی میں- بیٹھو!! دوبارہ ذرا سختی سے کہا گیا تو وہ جلدی سے سمٹ کر سیٹ کے ایک طرف لگ گیا- بیگم صاحبہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں اور اُنھیں مڑ کر دیکھنا گناہ تھا- مخملی سیٹ پر بیٹھ کر بھی وہ خوف سے دُہرا ہوتا رہا- یا خدا یہ کیسی کایا پلٹ ہے- تو نے مجھ گنہگار کی سُن لی- وہ عاجزی سے اللہ کا شکر ادا کرتا رہا-

گاڑی ایک بلڈنگ سائٹ کے پاس جا رُکی- دروازہ کھلا تو وہ جلدی سے نکل کر ایک طرف کھڑا ہو گیا- تابعداری سے نظریں جھکی ہوئی تھیں- بیگم صاحبہ باہر نکلیں- وہ ادب سے اور دہرا ہو گیا- وہ سراپا حسن و جمال تھی جس کی گاڑی میں وہ بیٹھا تھا- کیا کچھ کر سکتے ہو؟ ج- ج- ج جو آپ کہیں بیگم صاحبہ- اپنے ہاتھ دکھاؤ- وہ وہ وہ جھجکنے لگا- کب ایسے لوگوں سے اُس نے بات کی تھی- ڈرتے ڈرتے اُس نے ہاتھ آگے کیا- زخمی ہاتھ- اوہ مائی گاڈ!! تم تو زخمی ہو- وہ- وہ وہ دو دن پہلے اینٹیں اُٹھاتے کچھ اینٹیں گری تھیں- اِس وجہ سے وہ گھبرایا سا داستان سُنانے لگا- تو ایسے تم کام کر سکتے ہو؟ جی جی بیگم صاحبہ--- دو آنسو نجانے کہاں سے ٹپک پڑے- بیگم صاحبہ کا دل موم ہو گیا- سنو! اُس نے ڈرائیور کو بُلایا- پہلے اِس کی مرہم پٹی کراؤ- دوائی لے دو اور اِسے کچھ کھلاؤ- ٹھیک ہو جائے گا تو کام پہ لگا دینا- جی بیگم صاحبہ- ہاں اور سب مزدوروں کی رہائش اور کھانے کا انتظام یہیں کرنا- سرور صاحب کو بتا دو- کوٹھی کے دو کمروں میں گدے اور کمبل ڈال دے- ہاں تمہارا نام کیا ہے؟ وہ جانے سے پہلے پلٹ آئی- بہادر علی- ہوں-- چلو آؤ بہادر علی- ڈرائیور اشفاق حسین اُسے لے کر زیر تعمیر کوٹھی کی طرف چل پڑا اور اُس کے ساتھ آنے والے سب مزدور اُسے حیرت سے دیکھ رہے تھے-

جو حقارت سے دیکھا کرتے تھے وہ اب حسد کا شکار ہو رہے تھے- بیگم صاحبہ کی

خصوصی توجہ اُس پر تھی۔ وہ سب جل بھن گئے جب اُسے اشفاق حسین کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا۔ اشفاق حسین نے ایک کلینک سے اُس کی مرہم پٹی کروائی۔ پھر ایک ڈھابہ ہوٹل پر لے گیا۔ جہاں تین دن بعد اُس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ پھر وہ اُسے بازار لے گیا اور اُسے دو تین سلے ہوئے موٹے سوٹ بھی لے دیئے۔ یا میرے مولا! تو ایسے ایسے جلوے دکھاتا اور ہاتھ پکڑتا ہے کہ بندہ سوچتا رہ جاتا ہے۔ میری توبہ جو میں کبھی تجھ پر شک کروں۔ وہ دو دن میں ہی ٹھیک ہو گیا۔ اُسے کوٹھی کے اندر ہی کام مل گیا۔ کاریگر تو وہ تھا ہی، کھل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ دل لگا کر کام کر رہا تھا۔ اُس کے کام میں کافی نفاست تھی۔ مہینہ گزر گیا تھا۔ باقی مزدور بس کام کرتے اور اُس کے خلاف زیادہ سوچتے۔ بہادر علی کو کھانے، پینے، پہننے، سونے کو سب میسر تھا تو اُس کا مدقوق سا چہرہ بدلنے لگا۔

ایک مہینے بعد بیگم صاحبہ نے دیکھا تو پہچانا نہیں۔ بیگم صاحبہ نے بطور خاص اُس کا کام دیکھا اور خوش ہو گئیں۔ اشفاق حسین یہ لڑکا اچھا کام کرتا ہے، اِسے مستقل رکھ لینا۔ جی بیگم صاحبہ۔ باقی مزدور تو انتقاماً سست روی کا شکار تھے۔ ایک دن فضل دین نے پوچھ ہی لیا۔ بہادر بڑا چمک رہا ہے۔ بیگم صاحبہ کو پسند آ گیا ہے تو۔ کیا کہہ رہے ہو فضل دین خدا کا خوف کرو۔ مجھے اللہ نے ایک سہارا دیا ہے۔ اِس کے خلاف کچھ غلط سوچنا بھی مت۔ وہ یکدم اپنے رویئے کے برعکس غصے میں آ گیا۔ وہ ہماری ان داتا ہیں۔ ہم سب اُن کی وجہ سے یہاں ہیں۔ بس دل لگا کر اپنا کام کرو۔ کام تو ہم کر ہی رہے ہیں، پر تیری حرکتیں ٹھیک نہیں۔ کیا!!! وہ ڈر گیا۔ کیا کیا ہے میں نے!!! بہادر نے تیزی سے پوچھا۔ بیگم صاحبہ کے پیچھے کتے کی طرح دُم ہلاتا پھرتا ہے۔ تیرے خیالات ٹھیک نہیں۔ بہادر علی اِس الزام پر سرتاپا سُلگ اُٹھا۔ اپنی بکواس بند کرو۔ میں تمھارا سر توڑ دوں گا۔ فضل دین تم حد سے بڑھ گئے ہو۔ میں یہاں صرف مزدوری کرتا ہوں۔ سمجھے۔

ہاں ہاں ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ فضل دین زور زور سے بولنے لگا۔ اُس کا مقصد باقی مزدوروں کو بُلانا تھا جو بلا وجہ اُس پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ سب اِس منہ ماری میں حصہ ڈالنے لگے تلخ باتیں ہاتھا پائی تک جا پہنچیں تو سب اُس پر ٹوٹ پڑے۔ نجانے کون سا غصہ اور حسد نکالنے لگے۔ ساری کوٹھی میں بات پھیلی۔ سب لوگ بھاگے آئے۔ منیجر سرور، اشفاق حسین اور دیگر تب تک وہ بہادر علی پر اپنا غصہ اُتار چکے تھے۔ یہاں سے کوئی بھاگنے نہ پائے۔ منیجر

نے اپنا پستول نکال لیا۔ قریبی تھانے میں فون کیا گیا۔ آن کی آن میں پولیس پہنچ گئی۔ بہادر علی مشکل سے سانس لے پا رہا تھا۔ سارا بدن خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ کچھ لوگ بھاگنے لگے تو پرانے مزدوروں نے گھیرا ڈال لیا۔ اُن آٹھ لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا جو اُسے مارنے میں شامل رہے۔ بہادر علی کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ بیگم صاحبہ کو واقعے کی اطلاع ملی تو وہ بھاگی آئیں۔ بہادر علی کو دیکھا۔ ڈاکٹر اُس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اِس آدمی کو بچنا چاہیے۔ وہ تھانے پہنچی تو وہی سب لوگ تھے جنھیں وہ اُس تھڑے سے کام کے لیے لے کر آئی تھی۔

فضل دین تم سمجھدار آدمی لگتے تھے پھر ایسا کیا ہوا کہ تم نے بہادر علی کی جان لینے کی کوشش کی۔ وہ۔۔۔ وہ جی آپ کے بارے بُری باتیں کر رہا تھا۔ غلط بات۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ تھانیدار صاحب اِن سے سچ اُگلوائیں۔ کیونکہ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ حالات کا مارا ضرور ہے مگر بُرا آدمی نہیں۔ میں جانتی ہوں۔ اُس پر میری توجہ کی وجہ سے یہ سب حسد کا شکار ہوئے۔ جب تک بہادر علی ٹھیک نہیں ہوتا اِن کی ضمانت نہیں ہونی چاہیے بیگم صاحب! آپ فکر نہ کریں۔ ذات کے مزدور ہیں اور حرکتیں دیکھیں۔ بہادر علی کو ٹھیک ہونے میں پورے پندرہ دن لگے۔ ابھی بھی خون بہہ جانے سے کمزوری بہت تھی۔ تم ابھی گھر جا کر آرام کرو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے پھر آ جانا۔ کہاں جاؤں گا بیگم صاحبہ، مجھے یہیں رہنے دیجئے۔ میں جلد ہی کام شروع کر دوں گا۔ ٹھیک ہے آج تمہیں تھانے جانا ہے۔ اپنا بیان ریکارڈ کروا کر آنا۔ میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ ٹھیک ہے۔ وہ تھانے پہنچے۔ حوالات میں قید مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بھوکے ننگے لوگ مزدوری نہ ہونے سے گھروں میں فاقے، حالات خراب، جیل چلے جاتے تو کتنے خاندان بھوکے ننگے ہو جاتے۔ بہادر علی ان کے حالات دیکھ کر ڈر گیا۔

کیا سوچ رہے ہو بہادر علی، بیان لکھواؤ۔ اِن سب کو ٹانگ دوں گا میں۔ آپ اِن سب کو رہا کر دیں۔ کیا!! تھانیدار اور بیگم صاحبہ نے چونک کر حیرت سے اُسے دیکھا۔ میں نے اِن سب کو معاف کر دیا ہے۔ اِن کو رہا کر دیں۔ بہادر علی پھر سوچ لو۔ بیگم صاحبہ اُس کے بیان پر جز بز ہوئیں۔ بیگم صاحبہ آپ سفارش کر دیں۔ تھانیدار صاحب۔ وہ بولا۔ بہت نرم دل کا بچہ ہے۔ مر جاتا تو کون پرسانِ حال تھا پھر بھی اِن ناکام قاتلوں کو معاف کر رہا ہے۔ تو رہا کر دیں۔۔۔ جی کر دیں سب کو رہا۔ ماہا بیگم نے

بالآخر اُسے سراہا۔

''او رفیق جا، سب ماں کے جنوں کو لے کر آ'' تھانیدار گرجا۔

سب نہایت خستہ حالت میں شرمندہ کھڑے تھے۔ شکر کرو بندہ بچ گیا ہے اور اِس نے تم سب کو معاف کر دیا ہے مگر میں معاف نہیں کر سکتی۔ آج سے تم میری کوٹھی پر کام نہیں کرو گے۔ صرف بہادر علی کام کرے گا۔ اور شکر کرو بہادر علی تم جیسا نہیں۔ اُس نے تم سب کو معاف کر دیا ہے۔ جاؤ چلے جاؤ۔ سب شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔ بہادر علی کی قدر کچھ اور بڑھ گئی۔ تم نے اِن سب کو معاف کیوں کر دیا۔ بیگم صاحبہ نے اُس سے پوچھا۔ بھوک اور پیاس کا ایک خوفناک منظر اُس کی آنکھوں کے آگے لہرا گیا۔ جب اُس کے باپ پر ایسے ہی ایک جھوٹا کیس بنا کر اُسے حوالہ جیل کیا گیا تو پھر پورا گھر بکھر کر رہ گیا۔ بھوک سے بلکنے کا منظر وہ کیسے بھولتا۔ جب وہ کم عمری میں ہی شہر مزدوری کرنے آ گیا کہ باپ کے بعد گھر چلا سکے۔ دُنیا کے سارے دُکھ اُس نے اپنی جان پر سہے کہ بہن بھائی بھوکے نہ رہیں۔ ماں کا سہارا بن گیا مگر اکیلے ہونے کی وجہ سے اُسے کیسی کیسی سختیاں سہنی پڑیں۔ یہ تو صرف وہی جانتا تھا۔ وہ تو نادان تھے مگر دُکھ کی اِس بھٹی سے گزر کر بہادر علی بہادر ہو چکا تھا۔ دو آنسو آنکھوں سے ٹپکے اور دامن میں جذب ہو گئے۔ وہ جان چکا تھا جس کا کوئی نہیں ہوتا اُس کا خدا ہوتا ہے۔ خدا نے ماہا بیگم کو وسیلہ بنا دیا۔ اور خدا نے اُس کا ہاتھ تھام لیا تو وہ ترقی کرتا گیا۔ بہن بھائی پڑھ گئے۔ ماں اللہ کے پاس چلی گئی تو اُس نے سب کو اپنے پاس بُلا لیا۔ بہن بھائیوں کی شادیاں کیں۔ وقت نے جوان چہرے پر لکیریں ڈالیں تو ایک دن بیگم صاحبہ نے اُسے اپنے گھر بُلایا۔ تم بھی شادی کر لو اب۔ بہت قربانی دے دی۔ بس بیگم صاحبہ گذر گئی ہے اب تو۔ ارے کہاں ابھی جوان ہو۔ میں خود تمہاری شادی کراؤں گی۔ ایک بہت اچھی لڑکی میری نظر میں ہے۔ تو وہ یک بارگی شرما گیا۔ سب کچھ آپ کا ہی دیا ہوا ہے۔ بیگم صاحبہ۔ میرے منیجر سرور کی بیٹی ہے نائلہ۔ میرے فلاحی ادارے کو چلاتی ہے۔ اُمید ہے تمہیں پسند آئے گی۔ جیسی آپ کی مرضی۔ وہ جھجک گیا۔ یوں بالآخر اُسے بھی خوشی نصیب ہوئی۔ یہ سب تو اللہ کی دین تھی۔ وہ جس کا ہاتھ تھام لے پھر اُس کو کون روک سکتا ہے۔ اور یہ بات بہادر علی کو اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی۔ وہ ان سب کو ڈھونڈ نکالتا جو دُکھ اور غربت کی بھٹی میں پستے تھے اور ہر ممکن سب کی مدد کرتا۔

☆☆☆☆☆

کایا کلپ

جب وہ جنگل سے گزرتے ہوئے جھاڑیوں میں پھنس گیا تو کچھ دیر شاخوں میں الجھے ہوئے سانس بحال کرتا رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ کسی نے اسے حفاظت سے اٹھا کر ایک بڑے پتھر پہ لٹا دیا ہے۔ ہوش آنے پر اس نے دیکھا کہ کوئی عورت پتھر سے ٹیک لگائے یوں کھڑی ہے۔ جیسے اس کے اٹھنے کی منتظر ہو۔ اس کے سنہرے اور سفید بال پتھر پر بکھر کے لہرا رہے تھے۔ وہ جست لگا کے نیچے اترا۔ اور اس عورت کے پاؤں میں سر رکھتے ہوئے بولا مہربانی مجھ پہ اس طرح رحم کر کے میری زندگی بچانے کا کام مٹی سے بنا ہوا کوئی انسان انجام نہیں دے سکتا۔ میرے جسم پر کوئی زخم ہے۔ نہ تھکن ہے، نہ کمزوری ، میں سارے عمر تمھاری پوجا کرنے کی قسم کھاتا ہوں، عورت نے اپنا نرم ہاتھ اس کے شانے پہ رکھتے ہوئے کہا، اب اٹھ جاؤ۔ میں قسمت کی دیوی ہوں، وہ اپنے پاؤں کھسکا کے ذرا سی پیچھے ہٹ کے کھڑی ہوگئی۔ تا کہ وہ اپنے قدموں پہ کھڑا ہو سکے۔ لیکن وہ گہری چپ سادھے سجدے میں پڑا رہا۔ سانسوں کی حرکت اور دل کی دھڑکن کا اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اٹھ جاؤ اور مجھے اچھی طرح دیکھ لو دیوی نے جیسے حکم دیتے ہوئے کہا۔

تم نے مجھ تک پہنچنے میں بہت دیر لگا دی۔ وہ سجدے میں پڑے پڑے کسک کر بولا، میری زندگی کے کتنے برس مایوسی اور شکست میں ضائع ہو گئے۔ تم نے وقت پہ آ کر میری کبھی کوئی مدد نہیں کی۔ اس زمین پہ مجھے آج تک اچھا دن دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ نہ کوئی اچھا انسان، نہ وقت پہ کوئی اچھی چیزیں، نہ کبھی وقت پہ کوئی گاڑی ملی، نہ مصیبت میں کسی نے میرا ہاتھ تھاما، میں ایک دکھ اور مصیبت کا عادی ہو کر اسے سہنے لگتا تو دوسری مصیبت آ چمٹتی ہے اس زمین پہ میری زندگی عجیب وغریب اور طویل نخوستوں میں مبتلا رہی۔ میری

کلیم خارجی

عبادتیں رائیگاں اور محنتیں بے ثمر و بے صلہ رہیں۔ اب جبکہ میں جنگل میں آخری دن گزارنے آیا تو تم نے میری مدد کرنا بہتر سمجھا۔ اب میں تمھارے شکریے کے موڈ میں نہیں۔ کیونکہ مجھے تمھاری خواہش رہی تھی۔ نہ مزید زندہ رہنے کا مجھ میں کوئی شوق رہا۔ وہ سجدے سے اٹھ کر زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اور بے خوفی سے گھورتے ہوئے بولا تم قسمت کی دیوی ہو یا کسی کوٹھے کی طوائف۔ جسے صرف طاقتور اور دولت مند لوگوں کا ساتھ دینا آتا ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا۔ کہ تم نے کمینے اور مکار لوگوں کا اس وقت بہت ساتھ دیا جب وہ اکٹھے ہو کر کوئی واردات کرنے لگتے ہیں۔ مجھ جیسے تنہا، محنتی اور دیانت دار آدمی کو تم نے ہمیشہ دھوکے میں رکھا۔ تمھیں زیادہ تعداد میں طاقتور اور ظالم لوگوں کی صحبت پسند آتی ہے۔ اس لیے میں تمھاری آج کی پہلی اور آخری مہربانی ٹھکرا کے دوبارہ جھاڑیوں میں پھنس کر جینے یا مرنے کی کوشش کرونگا۔

تمھارا غصہ اور تمھارے گلے درست ہیں۔ قسمت کی دیوی تحمل سے بولی میں تمھارے تعاقب میں رہتی تھی۔ لیکن تمھارے راستے اس طرف سے گزرتے تھے۔ جہاں ظالم، بدکار اور کمینے لوگوں نے بازار سجا رکھے تھے۔ تمھارے گھر کے رستے میں جو عبادت گاہ تھی۔ اس میں ریاکاری کے سجدوں سے بچتے بچتے مجھے دیر ہو جاتی تھی۔ اور تم بہت آگے نکل کر غائب ہو جاتے تھے۔ پھر تم بھی تو مجھے انہی جگہوں پہ ڈھونڈتے اور پالنے کی آس میں گھومتے تھے۔ جہاں میرے پاؤں جل اٹھتے تھے۔ اور میرے چہرے پہ گرم کالک آ چپٹتی تھی۔ میں نے کبھی کمینے اور ہوس پرست لوگوں کی مدد نہیں کی۔ تمھیں جو کچھ ان کے پاس نظر آتا ہے۔ اسکی بدصورتی اور زہرپلا پن تمھیں اس لیے نظر نہیں آتا۔ کہ تمھاری آنکھوں میں تمھاری محرومی تھکن اور شکست کا درد پھیلا رہتا ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل سرکتے ہوئے قسمت کی دیوی کے بالکل پیروں میں پہنچ کر غصے سے پھنکارتا ہوا بولا میں نے ویسے بھی اب دوبارہ جھاڑیوں میں کود جانا ہے۔ لیکن دیر سے آنے پہ میں تمھارے پیروں کو اپنے دانتوں سے کاٹ کر اپنے ان ماہ و سال کی اذیت کا بدلہ ضرور لینا چاہوں گا۔ جو تمھاری بے حسی کی وجہ سے مجھ پہ پہاڑ بن کر چھائے رہے۔ حیرت ہے بلکہ افسوس ہے کہ تمھارے ڈر اور واہمے بھی مجھ جیسے کمزور انسانوں کی طرح تمھارے اندر کوئی اچھا کام کرنے کی جرأت پیدا نہیں کرتے۔ پھر اس نے بڑے بڑے مضبوط دانت دیوی کی

دونوں پنڈلیوں میں اس طرح گاڑھے کہ اس کا سنہری خون مٹی میں اس طرح جذب ہونے لگا کہ بھورے رنگ کی مٹی گہرے اودھے رنگ کی ریت میں تبدیل ہونے لگی۔ پنڈلیوں کو کاٹتے وقت اس نے جس قوت سے جبڑے کسے تھے۔ اب وہ کھل نہیں رہے تھے۔ اپنی حالت اور دیوی کی خون رستی پنڈلیوں کو دیکھ کر وہ وحشت زدہ ہوکر جنگل کے بجائے شہر کی طرف بھاگنے لگا۔ تو جنگل سے کچھ فاصلے پر شہر کے آوارہ کتوں نے اس پر بھونکنا شروع کیا۔ کئی درندہ قسم کے طاقتور کتوں نے اسے دبوچنے کی کوشش کی تو وہ جنگل کی طرف واپس دوڑا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے کتوں کا ایک غول اُسکے تعاقب میں تیزی سے بڑھتا رہا۔ گھنی اور خشک کانٹے دار جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر اس نے اپنی گردن اتنی طاقت سے پیچھے کی طرف کھینچی کہ اس کی پچھلی ٹانگیں اسکی گردن سے آلگیں اور اس سے پہلے کہ وہ کتوں کے جبڑوں میں پھنس جاتا۔ وہ ہوا میں اُچھلتا ہوا جھاڑیوں کے عین وسط میں گر پڑا شہر کے کتے اتنے وحشی تو نہیں تھے کہ وہ جھاڑیوں کی کانٹوں کی پروا کیے بغیر اسے دبوچ لیتے۔ اپنے آپ کو محفوظ پا کر اس نے اپنے سانسوں کو قابو کرتے ہوئے اپنے سامنے کے اس پتھر کو دیکھا۔ جس پر لیٹا وہ قسمت کی دیوی سے ملا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس گول سے بڑے پتھر کے ساتھ انسانی قد کے برابر ایک اور بڑا سنہرا پتھر بھی موجود تھا۔ اس نے غصے اور غم کی شدت میں قسمت کی دیوی کو للکارا لیکن اس کے منہ سے ہلکی سے ایک چیخ نکلی۔ جسے سن کر اس کے تعاقب میں آئے ہوئے کتوں نے شدت سے بھونکنا شروع کر دیا۔ اس نے جھاڑیوں کی شاخوں میں سے جھانک کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو شہر سے آئے ہوئے کچھ لوگ بھی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر اسے ایک بلند آواز سنائی دی، یار بہت عجیب جانور تھا۔ اس لیے تو شہر کے کتے مشتعل ہوگئے۔ یہیں جھاڑیوں میں کودتے ہوئے اسے دیکھا گیا ہے۔ اندر کہیں موجود ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں سر تو آدمی کی طرح تھے۔ کب تک اسے ڈھونڈیں گے یہ کہہ کر کسی نے جھاڑیوں میں آگ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک الاؤ چنگاڑنے لگا۔ اس نے پتھروں کی طرف دیکھ کر چیخنا چاہا۔ لیکن اس کی بھونکار کتوں اور الاؤ کی گونج میں گم ہوگئی خود کو پگھلتا دیکھ کر اس نے گرم اور سرخ راکھ پہ منہ رکھ دیا۔

☆☆☆☆☆

کوہ قاف کی پریاں

آج کا دن بڑا مبارک ہے۔ بھائی کا ولیمہ ہے۔ موقع و دستور کے مطابق، لنچ کا اہتمام گھر پر کیا گیا ہے۔ گلی کے ایک کونے میں تین چار دیگیں پکی رکھی ہیں۔ لیڈیز اور جینٹس آ رہے ہیں۔ چند ایک کے ساتھ بچے بھی ہیں۔ گھر کے اندر قدرے چھوٹے صحن میں دری پر مہمان خواتین کو بٹھایا گیا ہے۔ ایک کونے میں کھانے کی میز اور چند کرسیاں لگی ہیں۔ برابر والے مکان کی بڑی سی بیٹھک میں مرد مہمانوں کو بٹھایا گیا ہے۔ وہیں ایک کونے میں کھانے کا انتظام بھی ہے۔

لیڈیز سیکشن میں خواتین اپنے بچوں کے ساتھ کھانا کھا رہی ہیں۔ خاصا ہاؤ ہُو مچا ہُوا ہے۔ اسی اثنا دو برقعہ پوش نوجوان لڑکیاں اندر آتی ہیں۔ سلامتی و رحمت کا تبادلہ اور دو نہایت خوش جمال و خوش کلام میزبان لڑکیاں ان کا استقبال کرتی ہیں۔ ''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، خوش آمدید، لگتا ہے، کافی دُور سے چل کر آئی ہیں آپ دونوں۔ پیشانیوں پر ہلکا پسینہ آیا ہوا ہے۔ کونسی جگہ سے تشریف لائی ہیں؟'' ..... جواب ملا ''گوالمنڈی سے''۔ ''اور آپ کے ساتھ کون آیا ہے؟'' ایک شگفتہ شگفتہ کھلے چہرے والی نے پوچھا۔

''ہمارے بھائی طاہر ساتھ ہیں۔ ٹیکسی والے نے بھابڑا بازار میں ایک گلی کے سامنے چھوڑا اور کہا کہ یہ سیدھی محلّہ سید پوری کے اندر چلی جا رہی ہے''۔

''ارے آپ تو ہمارے بھیّا مراد علی کے دوست کی بہنیں ہیں۔ آیئے آیئے، یہاں آرام سے فرشی دری پر تشریف رکھئے۔ اور ہاں، پہلے ہم اپنا تعارف پیش کرتے ہیں۔ میں نسیم ہوں اور یہ چھوٹی بہن شمیم اور وہ جو سامنے کھڑی ہے اس کا نام ہے صبا کریم، اسے ہم ہر موسم میں ''آئس کریم'' کہتے اور ٹھنڈا ٹھنڈا مزہ لیتے ہیں۔ لیکن ٹھہریئے، بہنوں کی یہ لڑی ابھی چل رہی ہے۔ اس کے پہلے دو نمبروں پر ہماری باجیاں ہیں۔ سیما اور شیما۔ ہمیں فخر ہے، ہم اب بھی اُن سے مار کھاتے اور یوں چھوٹے کے چھوٹے بنے رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ کافی پہلے شادی کے بعد اپنے اپنے گھروں کو جا چکی ہیں۔ اس وقت وہ دونوں اندر پچھلے کمرے میں ہماری اکلوتی دلہن بھابی کے پاس ہیں''۔

''پٹائی'' کی بات پر دونوں مہمان لڑکیاں

محمد طارق علی

مسکرائیں اور اپنے اپنے نام بھی بتائے۔
اس موقع پر شمیم نے لقمہ دیا۔
"ماشاءاللہ کیا آسمانی آسمانی نام ہیں یعنی شمس وقمر، کبھی بھلائے نہیں بھولیں گے۔
لیکن ہمارا بہنوں والا ذکر ابھی جاری ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ بہنوں کی بھرمار کی وجہ سے ہمارا گھر "بہن منزل" کہلاتا ہے۔ کبھی گھر میں ساری بہنیں اکٹھی ہو جائیں اور بیچ میں بالاتفاق مراد بھیا آ کھڑے ہوں تو ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتے۔ اگلے کو پوچھنا پڑتا ہے کہ مراد کہاں غائب ہیں"۔
اسی کے ساتھ قہقہہ۔ "ارے ہاں، آپ کی امی نہیں آئیں، بلاوا سبھی کے لیے تھا"۔ نسیم نے پوچھا۔
"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لیے والد صاحب بھی گھر پر ہیں۔ البتہ طاہر بھائی مردانے میں موجود ہیں"۔ مہمان لڑکی نے کہا۔ شمیم نے طاہر کی بہنوں سے کہا "ہم نے مہمان کم بلائے تھے۔ آیئے اندر دلہن بھابی سے ملتے ہیں"۔
ادھر زنان خانے کی حالت کچھ ایسی تھی کہ اس میں گھپ اندھیرا ہوتا اگر در و دیوار پر بلب نہ لٹکائے گئے ہوتے۔ بجلی پڑوسیوں نے دے دی تھی۔ کمرے میں دلہن کے پاس مراد علی کی والدہ اور دو بڑی بہنیں موجود تھیں۔ ان سے چند منٹ رسمی باتوں کے بعد لڑکیاں پھر صحن میں آ گئیں۔ اتنے میں مراد علی نے اندر جھانکا۔ نسیم نے کہا:

"بھیا یہ آپ کے دوست طاہر صاحب کی بہنیں ہیں۔ یہ تینوں مہمان سید پوری کی پیچ دار گلیوں کی خاصی طوالت کاٹ کر یہاں تک پہنچے تھے۔ دونوں بہنیں کھانا کھا کر بھابی سے مل چکی ہیں۔ بہت خوش ہوئیں کہ ہم کتنی محنت اور کاوے کاٹ کر چاند کا ٹکڑا بیاہ کر یہاں لانے میں کام یاب ہوئے ہیں۔ اس وقت مہمان عورتیں کھانا کھا کر واپس جا چکی ہیں۔ اُدھر بیٹھک میں کیا صورت حال ہے؟"
"میں یہاں کی صورت حال دیکھنے آیا تھا۔ وہاں سے سب مہمان فارغ ہو کر جا چکے۔ اب چار پانچ کرکٹ والے دوستوں کا انتظار ہے۔ طاہر اور میں انھی کے ساتھ کھانا کھائیں گے"۔
"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ دونوں بیٹھک میں ہی رہیئے۔ اور ادھر ہم فرشی دری پر بیٹھ کر ذری کی ذری ستالیں۔ مگر بھائی، آپ کی ایک بات سے ہم بہت حیران و پریشان ہیں!" نسیم نے کہا۔
"کیوں بہنا! کون سی بات؟"
"کیا آپ کو کیپ بنانے والی کمپنی نے قسم دے کر یہ کہا تھا کہ خبردار، چوبیس گھنٹے میں سے پچیس گھنٹے یہ مغلیہ ٹوپی سر سے اِدھر اُدھر نہ ہونے پائے؟" سب بہنوں نے منھ میں دوپٹے ٹھونس لیے۔ "کہیں بھورانی نے نسیم کا یہ الاپ سن نہ لیا ہو"۔ شمیم نے آہستگی سے کہا۔

''تم بھی کمال کرتی ہو بہنا۔ میں اس گمان میں پڑ گیا کہ نجانے مجھ سے ایسی کیا خطا ہو گئی۔ میرے پرائمری جماعت کے استاد صاحب جو سید پوری محلے ہی میں رہتے ہیں، تشریف لائے تھے تو کیا مَیں اُن کے سامنے ننگے سر چلا جاتا؟'' مراد علی نے کہا اور باہر کو مُڑ گئے۔

پانچوں بہنوں کی شکلیں قریباً ایک جیسی ہیں۔ سبھی کے رنگ و روپ چم چم کرتے لیکن دونوں کنواری بہنوں کا تو جواب ہی نہیں، گویا چاندی کے ڈھلے ڈھلائے مجسمے لیکن بے جان نہیں، خوب ہنستے بولتے، چلتے پھرتے اور لہجے ایسے کہ شہد کی مٹھاس ٹپکاتے ہیں۔ طاہر کی بہنوں کے ساتھ فرشی دری پر پانچوں بہنیں ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھیں۔ تھوڑا گم سی کا سا انداز۔ اور اسی وقت اماں جان کی وہاں چپ چاپ آمد۔

''اری لڑکیو، ہیئے ہیئے، کیا لاپروائی سی لاپروائی ہے یعنی دن دہاڑے کا آرام۔ اُدھر بہوا کیلی۔ بس اس کے میکے کی دو تین عورتیں ساتھ ہیں۔ مَیں بوڑھی کب تک وہاں بیٹھی باتوں کی چھلنی چلاتی رہوں۔ ہیئے ہیئے، اَب کیا باپ کو بیٹھک سے اُٹھا کر وہاں زنان خانے کے اندر بٹھال دوں؟'' سرگوشی کے انداز کی ڈانٹ، اس طرح کہ آواز زنان خانے تک نہ پہنچ پائے۔ بڑی لڑکیاں ہڑبڑا کر اندر کی طرف بھاگیں۔ باقیوں کو اماں نے روک لیا۔ ''بس، زیادہ رش نہیں کرنا، نظر لگنے کا بھی اندیشہ ہے۔ ہاں، زنان خانے اور بیٹھک میں فوراً قہوہ بھجوا دو۔ مَیں اُوپر چلی، وضو بنانا ہے''۔

''شکر ہے، جان بچی۔ ہم صبح سے بچوں کے بل چل چل کر کام کر رہے ہیں لیکن ابھی ابھی اماں نے جلدی ہمارے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔ اب ہم قہوہ بنائیں گے لیکن بیٹھیں گے یہیں صحن میں۔ اَور ہاں، شمس و قمر، آپ دونوں بہنیں کوئی عجلت نہ دکھایئے گا۔ بیٹھی رہیئے۔ بلکہ سامنے میز پر جایئے، گرم قہوہ وہیں آپ نوشِ جاں کیجیئے۔ اماں کی ڈانٹ ہمارے لیے تھی، آپ کے لیے نہیں!'' اور اس کے ساتھ ہی نسیم و شمیم کی ہنسی کی شگفتہ کاریاں۔ تھوڑی ہی دیر میں چھوٹے چھوٹے فچان کھڑکنے لگے۔ اُدھر بیٹھک میں متوقع مہمان بھی آ گئے۔ اور وہاں لنچ کا آخری دور شروع ہو گیا۔

بیٹھے بیٹھے لڑکیوں نے اپنی اپنی تعلیم اور پسندیدہ مشاغل ایک دوسرے سے شیئر کیے۔ مہمان لڑکی قمر نے بتایا ''رحمٰن پورہ میں ہمارا اپنا مکان تھا۔ والد صاحب نے اچانک بیچ دیا۔ سو، ہم ہوئے بے گھر اور اب کرائے کے مکان میں پڑے ہیں۔ گھر آرام دہ اور خوب صورت تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ اسے نظر بد لگی''۔

''ہمارا یہ مکان دیکھ رہی ہیں آپ؟ اچھا

خاصا بھوت بنگلہ ہے۔ اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ کیا اسے کسی بد کی نظر کیسے لگ سکتی ہے؟ تقسیم سے پہلے جب بھی یہ بنا ہو گا، اس وقت سے آج تک اس مکان نے سفیدی کرنے والے کا منھ نہیں دیکھا۔ اگر وہ غلطی سے ڈیوڑھی تک آ بھی جائے تو یقیناً یہ اس کا منھ نوچ لے گا''۔ شمیم نے ایسے انداز سے کہا کہ سب لڑکیاں ہنس پڑیں۔

''سو، ہم اس میں بڑی ای جی سے رہتے ہیں''۔

''اس کالے محل کی اصل بات تو آپ نے سُنی ہی نہیں، سنیں گی تو حیرت سے غش کھا جائیں گی''۔ نسیم نے کہا۔

''وہ کونسی بات ہے جناب؟'' مہمان لڑکیوں میں سے ایک نے پوچھا۔

''ہمارے اس بلیک ہول نما گھر میں ایک تہہ خانہ بھی ہے۔ ایک مرتبہ کسی مہمان بزرگ نے ہمیں وارننگ کے طور پر بتا دیا تھا کہ تہہ خانے میں ایک جن رہتا ہے''۔ نسیم نے کہا۔

''کیا کہا جن؟ اوہ نو''

''اور اسی لیے ہم تہہ خانے کے دروازے تک کبھی بھول کر بھی نہیں گئے کہ نا معلوم ہم میں سے کسی کو اٹھا کر وہ واپس اپنے دیس کوہ قاف کی طرف پرواز کر جائے۔ اور...... اور''۔ اسی کے ساتھ چنچل شوخ ہنسی کا خاصا طویل طوفان اُٹھا اور جب ذرا تھما تو شمیم نے کہا:

''ہماری دونوں مہمان شمس و قمر اس بات کو خوب انجوائے کر رہی ہیں لیکن اگلی خطرناک بات یہ ہے کہ ممکن ہے وہ خبیث جن ہماری اس نسیم بہنا کو اٹھا کر یعنی کہ بائی ائر کوہ قاف لے جائے اور وہاں جاتے ہی کسی توتے میں اس کی روح کو قید کر دے تو یہ بہنا اور ہمارے لیے ایک بڑی مصیبت والی بات ہو گی۔ پچھلے زمانوں میں بہت ویلے شہزادے ہوا کرتے تھے۔ وہ کسی سبز پوش کا خاص تعویذ باندھتے، پھر نعرے لگا کر جن کو ہلاک کرتے، مقید شہزادی کو چھڑا کر اس کے محل لے جاتے اور اسی کے ساتھ شادی! ہائے ہائے، ایسے شہزادے اب کہاں؟''۔ پھر وہی بے روک ٹوک ہنسی۔

''سوال یہ ہے کہ اب آپ کیا کریں گے؟''

''یہی سوچا ہے کہ نسیم بہن کی شادی کر دی جائے تو یہ کوہ قاف جانے سے بچ جائے گی۔ مگر یہ مانتی نہیں۔ کہتی ہے کہ ہو سکتا ہے کوہ قاف کے بغیر کوئی سادہ سا شہزادہ یہیں چنڈی میں مل جائے''۔ ہنسی کے ہلکورے۔ نسیم نے شمیم کو گھورا۔ ''تمھیں جلدی ہے تم خود کر لو''۔ باتوں باتوں میں کلاک کی ٹک ٹک کا پتہ ہی نہ چلا کہ اصل بات کیا ہے اور وہ یہ کہ وقت آ لگا ہے سبھی مہمانوں کی واپسی کا۔

لیکن ٹھیک چند منٹ پہلے، بیٹھک سے قہوے کے ایک اور دور کی فرمائش آ گئی۔ فوراً تعمیل کی گئی۔ زنان خانے میں بھی گرم

قہوے کی پیالیاں پہنچائی گئیں۔ اماں نماز کے بعد وہیں پہنچ چکی تھیں۔ ادھر مہمان لڑکی قمر نے نسیم سے کہا: ''آپ لوگوں سے آج کی ملاقات بہت اچھی لگی۔ یہ مراد بھائی کا کنکشن نہ ہوتا تو اس وقت ہم کہیں اور ہوتے'' - ''ارے، کہاں ہوتے، ذرا ہم بھی تو سُنیں؟'' نسیم مسکرائی۔

''دراصل آج کل ہم بھی ایک اچھی سی بھابی کی تلاش میں ہیں۔ اور اب سوچ رہے ہیں کہ کہیں اور کیوں جائیں۔ آپ کی نظرِ کرم ہو جائے تو ہم بزرگوں کے سامنے دامن پھیلا دیں گے''۔

''ارے قمر بہن، آپ نے کچھ عجب سی بات کہہ دی۔ ہم لڑکیاں نہیں، شیور کی مرغیاں ہیں، جب جی چاہا کسی مرغی کو دبوچ کر چھری دکھا دی اور وہ چپ چاپ اگلی منزل کو چل دی۔ نہ آخری خواہش کی اجازت، نہ اس گڑبڑی میں بھاگنے کی کوئی سکت''۔ سبھی لڑکیاں ہنس پڑیں۔

''ویسے آپ کے بھائی کیا کرتے ہیں؟'' نسیم نے سرسری انداز سے پوچھا۔

''وہ اخبار روزنامہ ''ترنگ'' میں کام کرتے ہیں''۔

''یہ تو ایک مشہور اخبار ہے۔ انھیں تن خواہ اچھی ملتی ہوگی، گاڑی اور مکان بھی؟''

قمر کوئی جواب نہ دے پائی۔ ایسا کچھ تھا ہی نہیں۔

''قمر بہن، آپ باجی کی باتوں پر نہ جانا۔ انھوں نے خیالوں خیالوں میں جانے کس اڑیل آئیڈل کو پال رکھا ہے، نہ وہ ہٹے گا، نہ کسی نئی صورت کے بارے بات کی جا سکے گی'' شمیم نے غلیلہ چھوڑا اور مزید کہا ''ذرا ان کی عقل دیکھیے، ابھی پچھلے دنوں تک یہ چھت پر جاتی تھیں الگنی پر گیلے کپڑے ڈالنے۔ ایک دن اچانک جانا چھوڑ دیا۔ پوچھا، کیا ہُوا باجی؟ کہنے لگیں، ساتھ والی چھت پر ایک تیل چپڑے بالوں والا چھبیلا، اپنی صورت آزار کانی نظروں سے ہمیں دیکھتا ہے۔ بہانہ کبوتر اڑانے کا، ''آ، آ'' اور اشارہ ہماری طرف۔ ہم نے پوچھا تو کیا اس بادلے سے آپ ڈر گئیں؟ جواباً کہا ''لو ہم کاہے ڈریں۔ وہ زیادہ سے زیادہ کیا کر لے گا، یہی ناں اپنا رشتہ بھیجے گا یہاں، تو ہم بخوبی اس کی درگت بنا دیں گے''۔ پوچھا، وہ کیسے؟ ''اُسے یہاں گھر بُلا کر''۔ ''گویا، اُسے یہاں بلانا اتنا آسان ہے''۔ اب دونوں مہمان لڑکیاں اٹھیں، برقعے پہن لیے، دروازے کی طرف بڑھیں، شمیم ساتھ ساتھ۔ آہستہ سے بولیں: ''قمر بہن، ابھی آپ جائیے، بعد میں ہم مراد بھیّا سے بات کریں گے امید ہے کہ وہ اماں جان کو اپنے دوست کے لیے منا لیں گے''۔

☆☆☆☆☆

ماہی

اس کا اصل نام مزمل جبین تھا..... والدین نے اس کا یہ نام قرآن مجید کی ''سورۂ مزمل'' کے نام پر رکھا تھا۔ اس نے اپنی چوبیس سالہ زندگی میں اس مقدس نام کے عزت و ناموس کی حفاظت کی تھی۔ مخلوط تعلیمی ادارے میں پڑھنے کے باوجود کبھی کسی نامحرم سے ہاتھ تک نہ ملایا تھا اور نہ ہی کبھی کسی سے بنا مطلب کے بات ہی کی تھی۔

دسمبر 2019 میں وہ گھر کے نہ مساعد حالات کی وجہ سے اسلام آباد میں اک بیوٹی پارلر پر کام سیکھنے کے غرض سے آئی تھی۔ اس کے بابا لاہور میں ایک دکان پر بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ ان کی خراب صحت اور ڈھلتی عمر کی وجہ سے مزمل نے اپنے گھر، جس میں وہ سب کی چہیتی تھی، سے اڑان بھری تھی۔ محلے کی ایک ادھیڑ عمر عورت سلمٰی بیگم نے اسے اسلام آباد اپنی دوست کے پاس کام سیکھنے کے لیے بھیجا تھا۔

بیوٹی پارلر میں اسے کام کرتے ایک سال ہو گیا تھا اور وہ گاہے بہ گاہے اپنے گھر والوں کو کچھ رقم ایزی پیسہ کے ذریعہ بھیجا کرتی۔ اس کے بابا کی صحت، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید خراب ہوتی گئی، کام پر باقاعدگی سے نہ جاسکنے کی وجہ سے گھر کی ساری ذمہ داریاں رفتہ رفتہ مزمل کے کمزور کندھوں پر منتقل ہوگئیں۔ بابا کے علاج معالجے کے اخراجات بھی مزمل کو ہی اٹھانے پڑے۔

مزمل بچپن ہی سے ایک خاموش طبع اور سادگی پسند لڑکی تھی۔ اپنے اردگرد کے ماحول سے وہ قطعی متاثر نہ ہوئی تھی۔ اسلام آباد کے اس فیشن ایبل ماحول میں بھی وہ نہایت سادہ لباس اور عام شکل صورت کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے بیوٹی پارلر کی مالکن اسے اکثر اس کی ان عادات پر ڈانٹ دیا کرتی تھی کیونکہ اس کے ساتھ کی لڑکیاں بن سنور اور ٹائٹس پہن کر کام کرنے آتی تھیں لیکن وہ اس کی باتوں کو ان سنی کر دیتی اور ہمیشہ باپردہ ہو کر کام پر آتی تھی۔ مزمل کی پریشانیوں میں مزید اضافہ تب ہوا جب اس کے والد کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر چارپائی سے آ لگے۔ چھوٹے بھائیوں کے تعلیم کے اخراجات کا بوجھ بھی مزمل کے کندھوں پر آ گیا۔

مزمل گھر کے حالات کی وجہ سے ذہنی تناؤ کا شکار رہنے لگی، کام سے بھی غیر حاضر رہنا اس کا معمول بن گیا تھا، جس کی وجہ سے مالکن کی ڈانٹ ڈپٹ میں بھی روز بہ روز

آفتاب محمود شمس

اضافہ ہو رہا تھا۔ فرح اور صبا جو کہ مزمل کے ساتھ ہی پارلر میں کام کرتی تھیں ایک دن اس کو اپنے ساتھ قریبی ریسٹورنٹ میں لے گئیں اور اس کے لیے ایک نہایت پرتکلف عشائیہ کا اہتمام کیا۔ مزمل تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد ان کے اسرار پر کھانے میں شریک ہوگئی۔ فرح اور صبا علاقے میں موجود فحاشی کے اڈا کے سرغنہ دلاور کی ایجنٹ تھیں جن کے ذمہ، مجبور ولاچار لڑکیوں کو اپنے جال میں پھانس کر، دلاور کے غلیظ دھندے کا حصہ بنانا تھا اس کام کا ان کو باقاعدہ معاوضہ ملتا تھا اور وہ دونوں خود بھی بیوٹی پارلر میں کام کرنے کے پس پردہ ان ناپاک کاموں میں ملوث تھیں۔ آج کا یہ عشائیہ مزمل جبین کو اپنے جال میں پھانسنے کا پہلا داؤ تھا۔

دو تین ہفتوں تک اسی طرح کے دو چار مزید عشائیوں کا اہتمام کیا گیا۔ مزمل، فرح اور صبا کے ساتھ بے تکلیف ہوگئی تھی اور یہی وہ لمحہ تھا جب ان دونوں نے اپنی چال چلنی تھی۔ ان دونوں کو خوب معلوم تھا کہ وہ اپنی مالی حالات کی وجہ سے پریشان ہے اس لیے انھوں نے آغاز ہی میں مزمل کو مالی مشکلات سے باہر نکلنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی، مزمل جیسی سادہ لوح لڑکی ان کی چال کو سمجھ نہ سکی اور کام کی تلاش میں دلاور کے چنگل میں پھنس گئی۔ دسمبر کی ایک سرد شام کو وہ فرح اور صبا کے ساتھ دلاور کے ٹھکانے، جو فائیو سٹار ہوٹل میں موجود ایک نہایت ہی دیدہ زیب کمرہ تھا، موجود تھی۔ دلاور کی نظریں صوفے پر بیٹھی مزمل کے جسم کا طواف کر رہی تھیں۔ مزمل جو کہ سر جھکائے کبھی کبھار دلاور کو آنکھیں اُٹھا کر دیکھتی تو اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہو جاتے۔ کافی دیر گزرنے پر دلاور نے کنگھارتے ہوئے مزمل سے اس کے نام کے بارے استفسار کیا، جس کو سنتے ہی دلاور نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، ”انٹرسٹنگ، نام تو کافی خوبصورت ہے تمھارا۔“ دلاور نے طنز بھرے لہجہ میں کہا۔ دلاور کے قہقہے کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ مزمل کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

”آج سے تمھاری ساری ذمہ داری ہماری ہے...... رہائش سے لے کر علاج معالجہ تک تمھاری دیکھ بھال میں کروں گا۔ اور آج سے تم اس ہوٹل کے روم نمبر 312 میں شفٹ ہو جاؤ، اور ہاں آج سے تمھارا نام ”ماہی“ ہے۔ تمھیں اسی نام سے جانا پہچانا جائے گا۔“ دلاور نے مسکراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

مزمل کو نام بدلنے کا یہ معمہ سمجھ میں نہ آیا، وہ ان انعامات کی وجہ کا استفسار آنکھوں

ہی آنکھوں میں فرح اور صبا سے کر رہی تھی۔ لیکن وہ دونوں مسکرا کر اسے بس خاموش رہنے اور ہدایات سننے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ دلاور سے ملاقات کے بعد مزمل، فرح اور صبا کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی اور سارے راستے وہ دلاور کے بارے میں ان دونوں سے پوچھ رہی تھی اس کا بیوٹی پارلر یا سیلون کہاں پر واقع ہے اور یہ نام بدلنے کا ماجرا کیا ہے۔ اس کے اس سوال پر فرح اور صبا کے چہرے پر ایک عیارانہ مسکراہٹ پھیل جاتی۔

اگلی صبح فرح اور صبا، مزمل کا سامان ٹیکسی میں ڈالے اس عالی شان ہوٹل کے کمرہ نمبر 312 پہنچ گئیں۔ کافی دیر خوش گپیوں میں مصروف رہنے کے بعد فرح نے اپنے پرس سے آئی فون کا لیٹسٹ ماڈل نکال کر مزمل کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور ساتھ ایک لاکھ کا پیشگی چیک بھی اسے کے سپرد کر دیا۔ مزمل یہ سب دیکھ کر حیران و پریشان رہ گئی اور بار بار ان دونوں سے اس کرم نوازی کے بارے میں استفسار کیا، لیکن وہ دونوں مزید انعامات و کرامات کی یقین دہانی کراتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئیں۔

شام کے سائے ڈھل چکے تھے، مزمل چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے باہر گیلری میں چہل قدمی کر رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ مزمل نے دروازہ کھولا تو ایک بھاری بھرکم خاتون نمودار ہوئی جس نے اپنے بالوں کا بہت سلیقے سے جوڑا بنایا ہوا تھا۔ اس نے باریک لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

خاتون نے اپنا نام شیلا بتایا اور کہا کہ دلاور کے سارے کام کی دیکھ بھال اس کے ذمہ ہے۔ مزمل جو کہ پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی، اس نے دھیمے لہجے میں اپنے کام کے بارے پوچھا۔ شیلا نے اپنے چہرے پر سنجیدگی لاتے ہوئے کہا ''آج سے تمھارا جسم ہماری ملکیت ہے۔'' جواب سنتے ہی مزمل کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

مزمل پہلے تو اس کی بات کا مطلب سمجھ نہ پائی لیکن جب اس نے مزید تفصیلات بتائیں تو وہ چند لمحوں تک سکتے کی حالت میں دم بخود شیلا کو گھورتی رہی۔ اس کے ہوش بحال ہوتے اور اس سے پہلے کے وہ شدید ردعمل کا اظہار کرتی، شیلا وہاں سے جا چکی تھی۔ ماہی کو یہ اندازہ نہ تھا کہ غربت کسی لڑکی کو اس نہج تک بھی لا سکتی ہے کہ وہ اپنے عزت اور آبروں کا سودا کر بیٹھے۔ اس نے جلدی سے اپنا بیگ اٹھایا اور گھبراہٹ کے ساتھ لفٹ کے بجائے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی بلڈنگ سے باہر آ گئی۔

اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو ارد گرد پھرتے سب ہی مردوں میں اسے دلاور کا چہرہ نظر آنے لگا، جیسے یہاں موجود ہر ابنِ آدم اس کے جسم کا سودا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

رات مزمل نے نیند نہ آنے کے سبب نیند کی گولیوں کا سہارا لیا تھا۔ فرح اور صبا اس کے سرہانے کھڑی تھیں۔ ماہی خاموش تھی اور اس کے آنسو شبنم کے قطروں کی طرح اس کے گالوں سے پھسل رہے تھے۔ ”دیکھو، ماہی یہ دنیا بہت ظالم ہے، اگر تم یہ کام نہیں بھی کرتی تو کوئی تمھیں محبت کے خواب دِکھا کر آخر میں تمھارا جسم نوچ ڈالے گا یا کوئی بوالہوس تمھیں بے سہارا اور بے یارومددگار دیکھ کر تمھارا ریپ کردے گا۔ ہم نے یہاں تم جیسی بہت سی لڑکیوں کو اپنی جان دیتے ہوئے دیکھا ہے جو اس معاشرے کی ہوس کا نشانہ بن اور بعد میں قصہ پارینہ بن چکی۔ تمھارے گھر کی مشکلات اس قدر زیادہ ہیں کہ تم اس معمولی پارلر پر 24 گھنٹے کام کرو تو ان کا حل نہیں نکلنے والا۔“ ماہی اپنے گھٹنوں میں سر دیئے زارو قطار رونے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وقت نے اس کو کس چوراہے پر لا کھڑا کر دیا، ایک طرف آگ ہے تو دوسری طرف پانی۔

مزمل کی تصویر دلاور کی وٹس ایپ سٹیٹس پر ”ماہی“ کے نام سے سج چکی تھی۔ چند ہی منٹوں میں ہزاروں میسج اس کے جسم کا دام لگائے دلاور کا موصول ہوئے، جن کو پڑھ کر دلاور کے چہرے پر عجیب سی خوشی کے آثار مختلف رنگوں میں لپٹے نمودار ہو رہے تھے۔ دوسری طرف فرح اور صبا نے مزمل کے کمرے میں بہت سے بیہودہ اور عریاں ملبوسات کا ڈھیر لگا دیا۔ مزمل نے ان کو رخصت ہونے کو کہا تا کہ وہ اپنے آنے والے کسٹمر کے لیے سج سنور کر ”ایک رات کی دلہن“ بن سکے۔ فرح اور صبا دلاور سے اپنے حصے کی رقم لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

مزمل کی عزت کا سودا پورے ڈیڑھ لاکھ میں شہر کے کسی سیٹھ کے ساتھ طے پایا تھا اور دلاور کی زبانی، مزمل کو چند گھنٹوں میں اس کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں ایک بے رحم جلاد کے قدموں کی چھاپ کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ شب کے دس بجے مزمل کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی جس نے ان کے دل میں ہل چل مچا دی۔ مزمل نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ دروازے کھولتے ہی اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑا چاقو سیٹھ کے سینے میں اتار دیا اور اور دو تین زناٹے دار تھپڑ دلاور کے چہرے پر رسید کرتے ہوئے باآواز بلند کہا۔ ”کمینے انسان، تو مجھے مزمل سے ”ماہی“ بنائے گا، تو مجھے مزمل سے ”ماہی“ بنائے گا۔ میں نے تیری ساری کارستانیوں کی خبر پولیس کو دے دی ہے“ دلاور کو ان سب کی توقع نہیں رکھتا تھا، کبھی سیٹھ اور کبھی مزمل کی طرف لپکتا جو کہ مکمل پردے میں ملبوس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

☆☆☆☆☆

احساسِ رائیگانی

صبح ہی صبح دروازے پر گھنٹی بجی تو آمنہ نے فوراً گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بجے تو شہناز آیا کرتی تھی۔ آج ایک مہینے بعد اسی وقت بیل کی آواز پر اس نے چونکتے ہوئے دروازہ کھولا۔ آمنہ کو حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ شہناز اس کی دل پسند مددگار تھی جس کی موجودگی اسے ہر فکر سے آزاد کر دیا کرتی تھی مگر اب تو وہ ایک مہینے سے بچے کی پیدائش کی وجہ سے چھٹی پر تھی۔

شہناز نے آتے ہی کمبل میں لپٹا ہوا بچہ دکھایا جو شاید کچھ دیر پہلے ماں کے ساتھ لپٹ کر سو رہا تھا اور اب اپنی نیند پوری کر کے رونے کی تیاری کر رہا تھا۔

آمنہ نے بچے کو دیکھ کر کہا یہ تو دوسرا یوسف ہے، بلکل اپنے باپ پر گیا ہے۔

ہاں باجی سب یہی کہتے ہیں۔

شہناز نے آتے ہی قالین پر بیٹھ کر بچے کو چھاتی سے چمٹا کر دودھ پلانا شروع کر دیا۔ شہناز کی گود میں بیٹھا بچہ اس کی بھری بھری چھاتیوں سے چمٹ کر یوں دودھ پینے لگا جیسے جنم جنم کی بھوک مٹا رہا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ شہناز مہینے بھر کی کہانیاں یوں فر فر سنانے لگی جیسے وہ یہی سنانے آئی ہو۔۔

آمنہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا تم تو ابھی چلا بھی نہیں نہائی اور نہ ہی تمہاری چھٹی ابھی ختم ہوئی ہے پھر اتنی جلدی کیسے آ گئی۔

میرے میاں نے کام پر جانا تھا اس لیے صبح ہی صبح اس کے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر آ گئی ہوں اور اب واپسی پر ویگن پر بیٹھ کر چلی جاؤں گی۔

باجی میں ایک کام کے لیے آئی ہوں۔ میرا دودھ میرے بچے کی بھوک نہیں مٹا پاتا اور بچہ رات بھر بھوکا رہ کر روتا رہتا ہے۔ ہسپتال کے خرچے میں سب جمع پونجی خرچ ہو گئی۔ اب ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بچے کو فارمولا دودھ بھی لگا دو۔

اچھا اچھا ٹھیک ہے، آمنہ فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی بات سمجھ گئی۔

آمنہ نے مطلوبہ پیسے شہناز کی ہتھیلی پر رکھے تو شہناز نے پیسے مٹھی میں بند کر کے اپنے بیٹے کو دو دفعہ چوما اور دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

شہناز تو رخصت ہو گئی مگر آمنہ شہناز کی گود میں ہمکتا ہوا بچہ دیکھ کر کہیں دور کسی اور ہی زمانے میں کھو گئی۔ یوں جیسے گرد و پیش سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ ماضی پھولوں سے بھرے باغیچے کی طرح اس کے اردگرد پھیل

نعیم فاطمہ علوی

کر اس کے خیالات کو گلاب چنبیلی اور رات کی رانی کی خوشبو سے مہکانے لگا۔

اسی حالت میں آمنہ نے کاغذ پین اُٹھایا اور جذبات سے مغلوب لفظوں کی مالا پرونے لگی۔ یکا یک آمنہ کی گود شہناز کے بیٹے کی طرح ابراہیم کے وجود سے بھر گئی تو اس نے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے پیار سے دیکھا اور اس کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ وہ اپنے شیر خوار بچے کو دیکھ دیکھ کر تسکین نہیں پا رہی تھی۔ پھر اس نے ابراہیم کی کمر کو دھیرے دھیرے سہلانا شروع کر دیا۔ نجانے کیسا سرور تھا جو اس کے تن من کو محبت کی پھوار سے بھگو رہا تھا۔ آمنہ نے سوچا کیا اس سے بڑا لطف و سرور بھی دنیا میں ہو سکتا ہے کہ میری گود میں میرے وجود کا حصہ میرا جیتا جاگتا بچہ جسے میں نے نو ماہ اپنے پیٹ کے نہاں خانوں میں رکھ کر سینچا۔ کتنے اطمینان سے سو رہا ہے۔

ابراہیم کی رگوں میں میرا ہی تو خون دوڑتا پھرتا تھا میری ہڈیوں کے سے اس کی ہڈیاں بنیں۔ میرے نوالوں کا حصہ دار بنا۔ کوکھ میں بھی تو مجھے اس کے وجود کے ایک ایک لمحے کی خبر تھی۔ میری مامتا کو تو حمل ٹھہرتے ہی ایک خوشی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس شرارتی بچے نے شروع کے تین مہینے کیسے مضطرب رکھا۔ طبیعت بوجھل بوجھل سی اور ابکائیاں آتیں۔ کچھ بھی کھانے کو دل نہ چاہتا۔ دماغ عجب چکروں کی زد میں رہتا۔ کھڑے ہونا بھی مشکل لگتا کیسے دیوار کا سہارا لے کر باتھ روم تک جاتی تھی۔ مگر یہ احساس کہ میں ماں بننے والی ہوں سب مشکلوں کو آسان کر دیتا ہے۔ کھانے پینے کی ہر نعمت سے محروم ہونے کی وجہ سے آئرن کے انجیکشنوں سے کتنی تکلیف ہوتی تھی۔ یوں جیسے جسم میں سانپ لوٹ گیا ہو۔ مگر ماں بننے اور بچے کو صحت مند رکھنے کا احساس زندگی کی ہر تکلیف کو رفع دفع کر دیتا۔

اور پھر آمنہ اُن دنوں کو یاد کرنے لگی جب ابراہیم نے پیٹ میں ہلنا شروع کر دیا تھا۔ اور وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اس کے ہلنے جلنے پر شاداں ہو کر اُس کی آمد کے دنوں کو انگلیوں پر گنا کرتی تھی۔

جب نو مہینے انتظار کے بعد درد زہ شروع ہوا تو یہ بدن جس کو کوکھ میں ایک ننھی سی جان پل رہی تھی اچانک یوں بدلنے لگا جیسے زلزلوں کی زد میں ہو۔ درد کی لہریں اٹھتیں اور پھر غائب ہو جاتیں درد بھی ایسا کہ خدا کی پناہ۔ ڈاکٹر نے کہا ایک وجود کی کوکھ سے دوسرا وجود جنم لے رہا ہے یہ سب مشکلیں تو سہنی پڑیں گی۔ رات کے پچھلے پہر جسم میں درد زہ اٹھا اور اگلے دن دو بجے کہیں ابراہیم نے اس دنیا میں سانس لیا۔ کیسے ہم دونوں میاں بیوی رات بھر اس ننھے وجود کو دیکھتے رہے۔ جسے اپنی زندگی کی بقا کے لیے ماں کی چھاتیوں سے دودھ کشید

کرنا بھی نہیں آتا تھا۔
پگلا کہیں کا--
وہ دل ہی دل میں مسکرایا مگر لب اس احساس کو محسوس کر کے مسکرانے لگے - آنکھوں میں بھی مستی سی بھر آئی- اسے یاد آیا کہ میں تو بھول ہی گئی تھی کہ کائینات کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہے- کائنات تو میری کوکھ سے شروع ہو کر میری گود تک محدود ہو گئی تھی اور مجھے اپنے بچے سے جنت کی مہک آیا کرتی تھی- مجھے محسوس ہوا کرتا کہ دونوں جہان کی خوشیاں میرے وجود میں ہی پنہاں ہیں-
اور پھر کب ابراہیم گود سے نکلا کب اس نے ناک صاف کرنے سے لے کر اپنے جسم کو صاف کرنا تک سیکھا اور کب مجھ سے حرف حرف سیکھ کر دنیا میں رہنے کے گُر جانے-- کب اس نے اپنی شناخت بنا اور پھر کب اس نے اپنا گھر الگ کر کے اپنی دنیا بسالی-
آمنہ قلم اپنے گال پر رکھ کر محبت کی شدت سے اپنے بے ترتیب خیالات کو یکجا کر کے سوچنے لگی آخر کب میں وقت کی طنابیں کھینچتے کھینچتے تھکن سے چور ہوئی اور میرے ہاتھ پاؤں جو ابراہیم کو پالتے ہوئے جوان تھے بوڑھے ہو کر اعتدال کھونے لگے-
آنکھوں کے چراغ بھی تو ٹمٹمانے لگے-
اور پھر دو ننھے منے آنسو اچانک اس کی آنکھوں سے چھلک کر قلم کے بیچ سے ہوتے ہوئے سفید کاغذ پر آ گرے حروف کی سیاہی پھیلنے لگی- یہ دو آنسو تو ہراول دستہ تھے اس کے بعد آنسوؤں کا سیلاب آیا آمنہ نے کرسی سے ٹیک لگا کر انہیں بہنے دیا- اور وہ دیر تک بہتے رہے-
آنسوؤں کے بہہ جانے سے غبار آلود خیالات پر چھائی دھند بھی چھٹ گئی- اور زمانہ بھی بدل گیا
اب آمنہ کے کانوں میں صرف چند الفاظ کی گونج تھی- جن کو لکھنے کے لیے اس کے قلم کی سیاہی ختم ہو چکی تھی-
''ماں بچے تو سب عورتیں پیدا کر کے پالتی ہیں آپ نے کیا کمال کیا؟ آپ کے پاس مال و دولت سب کچھ ہی تو ہے- بس میری مصروف دنیا سے دور رہو''
آمنہ کے ہاتھ کپکپانے لگے-- دماغ میں اس خیال نے بھی کمند لگائی کہ کہیں شہناز کی گود میں پلنے والا بچہ بھی ایسا ہی نہ ہو-
نہیں نہیں
اللہ نہ کرے
کائنات کا ہر رنگ جدا ہے
آمنہ نے ہجر سے چور پیاسی روح کے ساتھ مسکراتے ہوئے شہناز اور اس کے بچے کو ہزاروں دعائیں دیں-- اور اس نامکمل تحریر کو دیکھ کر سوچا زندگی کی رائیگانی کا احساس دلاتے یہ حروف میں نے کیوں لکھے؟
پھر اس کے اندر سے آواز آئی-- نہ لکھتی تو شاید گھٹ کے مر جاتی-

☆☆☆☆☆

نم گرفتہ

زندگی، ایک لوہار کی دھونکنی ہے
مدرسہ، معدنی کوئلے کی دہکتی ہوئی،
دوزخ آثار، بھٹی کا، سربند، دَر ہے
تجربہ، پنجۂ آہنی کی پکڑ اور زنبور کی رنج دیتی جکڑ ہے
آگہی سطحِ سندان پر
آہنی سوچ کے رخ برستے ہتھوڑے کی
اعصاب فرسا ضَرت ہے
آدمی، سرخ لوہے کے مانند، سندان پر
ایک لوہار کی آہنی سوچ کے رُخ کھڑا
آخری تن شکن ضرب کا منتظر ہے
ارتقا، کارِ تکوین کا تن شکن تجربہ ہے

فلسفہ، تجربی آگہی ہے
راستی، ایک اندھی گلی ہے
راستی، چشمِ نم، اہلِ غم کے لیے ایک اندھی گلی ہے
چاند، نادار کی جھونپڑی کا دیا ہے
عاشقی، چاند کے رُخ ہمکتا ہوا بچپنا ہے

ارتقا، مدرسے سے بہت دُور
دریا کنارے لہو میں اُچھلتی ہوئی موج میں
تختیاں توڑتا بچپنا ہے

آگہی، ساعتوں میں گندھی ساعتوں کی مہک ہے
راستی، مدرسے اور گھر کے مَیاں مخملیں راستہ ہے
فلسفہ، تتلیوں کی ہوس ہے
تجربہ، باپ کی گور کے پائنتی ہے
زندگی، ایک نامختتم ہجر کی، ایک نامختتم داستاں ہے
پارسائی، کراں تا کراں، جھلملاتی جدائی کی جادُوگری ہے
عاشقی، پابرہنہ قبیلوں کے تن چیرتی، ہڈیاں چھیدتی
سردیوں کی کٹیلی ہوا ہے

زندگی، کچھ معزز گھرانوں کے افراد کی مشترک داشتہ ہے
آگہی، ہم غریبوں کے آقاؤں کی خواب گہ ہے

تجربہ، خواہشوں سے اَٹا راستہ ہے
فلسفہ، گوشت، کا لجلجا لوتھڑا ہے
راستی، گنگ لب، چشم نم، اہلِ غم کے لیے
ظلم ایجاد اَذہان کی ہم قدم مذہبی پیشوا ہے

راستی، بیسوا ہے
زندگی، چشم نم داشتہ ہے
زندگی، گنگ لب، چشم نم داشتہ ہے
زندگی، اپنے آقاؤں کی داشتہ ہے
زندگی، اپنے بے چہرہ آقاؤں کی داشتہ ہے، مگر باکرہ ہے
زندگی، گنگ لب، چشم نم باکرہ ہے
زندگی، باکرہ ہے
راستی، ایک اندھی گلی ہے
زندگی، آخری تن شکن ضرب کی منتظر ہے
تجربہ، باپ کی گور کے پائنتی ہے
زندگی، ایک نامختتم ہجر کی ایک نامختتم داستاں ہے
آگہی، نم گرفتہ مژہ ہے
فلسفہ، دُور بیں کا ہنہ ہے
زندگی، نیل میں ڈوبتی باکرہ ہے

خالد احمد

قیامت

اِس دُنیا کا شہری ہونا ایک مصیبت ہے
اس دنیا نے پگ پگ، پل پل، صرف مجھے پامال کیا
میں بھی اس دنیا سے ایک شدید عداوت کے جذبے میں زندہ ہوں
اب تو مجھے یوں لگتا ہے، جیسے یہ دنیا
ایک شدید حقارت کا
اِک قلعہ بند عداوت کا
اِک اندھی نفرت کا
اِک اَن دَھڑ لشکر ہے

یہ دنیا،
یہ ہتھیاروں کی دنیا
ہتھیاروں کے ہر تاجر کے لیے
اِک بے اندازہ نفع کما جانے کا
ایک سنہری موقع ہے

اب تو مجھے یوں لگتا ہے، جیسے یہ دنیا
رنگ و نسل کا، دین دھرم کا
ہر سنگین تعصب کا
پتھریلا قلعہ ہے

اِس دنیا کے شہری،
اِن پتھریلی دیواروں کے قیدی ہیں

رنگ و نسل کی، دین دھرم کی،
اونچی اونچی، موٹی موٹی، دیواروں کے قیدی ہیں
اِس خانہ خانہ دنیا کا شہری ہونا ایک مصیبت ہے
اسلحہ ساز بساط بچھائے بیٹھے ہیں
اِس شطرنج کا مہرہ ہونا، ایک مصیبت ہے
میرے ہونے کی خوشبو
اِس دنیا کی بدبو پر قابو پا سکتی تھی
لیکن دنیا مجھ کو دیکھ کے
اپنی ناک پہ ریشمی رُومالوں کے
ڈھانچے باندھ کے مجھ پر حملہ آور ہوتی ہے
امن سے ایک شدید عداوت، اِس دنیا کا ورثہ ہے
یہ بوڑھی دنیا اس تَر کے پر ناز اں ہے
کمر خمیدہ اسلحہ ساز بساط بچھائے بیٹھے ہیں
ہتھیاروں کے ہر تاجر کے لیے
یہ لمحہ ایک سنہری موقع ہے
امن طلب یاروں کے لیے یہ لمحہ، یہ ساعت،
آخری موقع ہے
آخری اور سنہری موقع، تاریخی لمحہ
یہ دنیا اِس ساعت سے کترا کر چلتی ہے
جنگ سے نفرت، اس ساعت کی خوشبو ہے
اسلحہ سازی، اس ساعت کو دیکھ کے
اپنی طوطوں جیسی ناک پہ ریشمی رُومالوں کے

ڈھانچے باندھے اِس ساعت پر حملہ آور ہے

اِس پتھریلے قلعے کے کچھ قیدی

اِس حملہ آور لشکر کے ساتھی ہیں

اِس خانہ خانہ، آئینہ خانے کا، دیوانہ ہونا، ایک مصیبت ہے

کچھ شمشیر بہ کف دیوانے،

کچھ شمشیر بہ کف عکسوں سے

مصروفِ پیکارِ آخر ہیں

مجھ کو ایسا لگتا ہے

جیسے یہ دیوانے، اب اپنا آئینہ خانہ، کرچی کرچی کر دیں گے

عکس کے ساتھ ہی، عکسِ عکس بھی

قریہ قریہ، خانہ خانہ، کرچی کرچی کر دیں گے

اِس شطرنج کا مہرہ ہونا، ایک قیامت ہے

یہ لمحہ، یہ ساعت، رنگِ صبحِ قیامت ہے

اِس دنیا کا شہری ہونا، ایک قیامت ہے

خالد احمد

دامِ بے دامی

ہوا کے دوش پر اڑتے ہوئے پتے
توازن کیا ترازو اپنا کر پائیں
وہ کیا جانیں کہ کس لمحے
کہاں ٹھہریں کدھر جائیں

نشیمن سے گرا اک بوٹ چڑیا کا
کرے پرواز کیا
پاؤں پہ استادہ نہ ہو پائے
نہ بارِ درد ڈھو پائے

چمن کا راستہ بھولی ہوئی تتلی
در و دیوار سے ٹپخے نہ سر کیسے
پروں پر غیب سے اتری ہوئی
ترتیب رنگوں کی
نہ ہو زیر و زبر کیسے

کسی کمزور بھنورے کو
کہیں مکڑی کے جالے میں
پڑے ہوں جان کے لالے
وہ سپنے گل کے کیا پالے

الٹ ڈالے گئے کچھوے سے
سیدھی چال چلنے کا تقاضا کیا
سنبھلنے کے جتن سارے عبث ٹھہریں،
لہٰذا کیا۔۔۔

سرِ صحرا
کوئی بھٹکا ہوا رہگیر آخر
ریت کے طوفان میں
کیا دیکھ پائے
کتنا چیخے، روئے، چلّائے
مدد کو کب کوئی آئے

سمے نے
کس قدر مقہور کر دی زندگانی
ہوئے اک دوسرے سے دور
سب حرف و معانی
کہیں کیسے کہ
کہ اپنی صورتِ حالات کیا ہے
ضرورت کے مقابل
جیب کی اوقات کیا ہے

جلیل عالی

چند کھری باتیں

بات سچی جو منہ پہ آجائے
سچ ہے ناگفتنی بھی شرمائے
ہوش کو بے وفا نہ ہونے دیں
تمکنت پر نہ کوئی حرف آئے
غمِ دنیا کو جاگزیں کر لیں
ذات کا زخم بھی نہ مرجھائے
ہو یہاں اقربا کی دل جوئی
بے اماں دوسرا نہ ہو جائے
اپنی شہرت کو منتشر نہ کریں
دوسروں کو یہ حق دیا جائے
وصفِ تخلیق ہے گراں مایہ
اس کا اظہار بھی شرف پائے
درِ فیاض کو کھلا رکھیں
جو بھی آئے، مراد کو پائے
رزق پائے حلال کا رشتہ
کھائے منہ کی حرام جو آئے
برگِ سرسبز کی عطائیں ہیں
اپنوں غیروں کو دیتا ہے سائے
خوب صورت ہو ظاہری نقشہ
خوش ضمیری بہار لے آئے
چلتے رستوں کو خوب چلنے دیں
بے جا بندش نہ راستہ کھائے
ہو ریاضت کی کارفرمائی
اس پہ کیوں نہ ریاض اترائے

سید ریاض حسین زیدی

شہرِ آشوب

یہ گھر ہے تو اس کے در و دیوار کدھر ہیں
یہ شہر ہے تو کوچہ و بازار کدھر ہیں

وہ، جن سے دمکتے تھے، مہکتے تھے در و بام
وہ شعلہ صفت، صورتِ گلزار کدھر ہیں

اٹھتے ہیں مرے شہر سے اب آگ کے شعلے
وہ میرے مسیحا، مرے غم خوار کدھر ہیں

ہر شخص سے یہ پوچھتا ہے خونِ شہیداں
قاتل وہ کہاں ہیں، وہ گنہگار کدھر ہیں

ہاں اب تو پسِ قتل ہمیں اتنا بتا دو
یہ کھیل ہے تو کھیل کے کردار کدھر ہیں

قبضہ ہے مرے شہر پہ تخریب گروں کا
کچھ بھید نہیں قوم کے معمار کدھر ہیں

میں کوچۂ قاتل سے سلامت نکل آیا
تم پوچھتے ہو دامن و دستار کدھر ہیں

ہر شخص یہاں امن کی کوشش میں مگن ہے
لیکن مری جاں! امن کے آثار کدھر ہیں

درپیش ہے ہجرت کا سفر پھر پسِ ہجرت
ہے کوئی جو بتلائے کہ انصار کدھر ہیں

محمد انیس انصاری

بنیاد پرست

یہی صحیفوں میں لکھا ہے
یہی کتابوں نے سمجھایا
انس بنا ہے انسانوں کی
روز ازل میں جب خالق نے
مٹھی بھر مٹی کو گوندھا
شکل اسے بخشی پتلے کی
اک بے جان وجود رہا وہ
جب تک خاکی جسم کے اندر
روح محبت کی نہیں آئی
آدم وحوا کی الفت سے
جنت کی تشکیل ہوئی
بعد میں نفرت کے پودے نے
ان کے بیچ میں دوری ڈالی
جس سے جیون دوزخ ٹھہرا
آج بھی پیار ہے خلد کا رستہ
اس کو آدم زاد نہ بھولے
چاہے اور بھلا دے سب کچھ
بندے کو بنیاد نہ بھولے

گلزار بخاری

نظم

قیوم طاہر

[فتح محمد ملک کے لیے]

وہ اجلی آنکھ رکھتا ہے

وہ خالی آسمانوں میں بھی بادل

ڈھونڈ لیتا ہے

وہ پانی کھوج لیتا ہے

کسی جلتے ہوئے تھل میں

سیہ کالے پہاڑوں میں

سلگتی دھوپ میں

چیختی ہوئی مٹی میں

جیون ڈھونڈ لیتا ہے

میانِ سطر جو لکھا ہے

کیا مفہوم رکھتا ہے

وہ اس کو جانتا بھی ہے

وہ بھیدوں سے بھرے چہروں کے

پیچھے جھانکتا بھی ہے

وہ آئینے کی صورت ہے

وہ جس رخ پر بھی رکھا ہو

کبھی جھوٹا نہیں ہوتا

اے مری زہرہ جبیں!

اے مری زُہرہ جبیں!
تُو نے کس آگ کے امتحاں میں رکھ کے خود کو
پگھل جانے کی قسم کھائی ہے
مُسکرا اے مری زہرہ جبیں
دیکھ تو رستے میں ترے
اب بھی رقصاں ہیں کتنے ستارے
اے مری زہرہ جبیں! تری ہستی کا نشاں روشن ہے
اس پہ لکھی ہے بخت پینا کی کتھا
تو نے کچھ خواب جو تمنا کی زمیں میں بوئے
اُس پہ اُگ آئے ہیں، تازہ امنگوں کے گلاب
اے مری زہرہ جبیں!
دیکھ تو آ کے ان کو
چھوڑ جانے دے
نظر اُٹھا، آنکھ تو ملا
بتا تو ذرا
تُو نے یہ کس آگ کے امتحاں میں رکھ کے خود کو
پگھل جانے کی قسم کھائی ہے

نثار ترابی

نظم

لے مَیں نے کر دیے خود ہی ترے حوالے پَر
اُڑان بھرنے سے پہلے ہی کاٹ ڈالے پَر

یقین تھا کہ کبھی صبحِ نَو بھی آئے گی
اندھیری رات میں ہم نے تبھی سنبھالے پَر

وہ سیر ہو کے کبھی خود بھی کھا نہیں سکتا
نظر جو رکھتا ہو ہر ایک کے نوالے پَر

ترے نصیب میں اونچی اُڑان ہے کہ نہیں
ہماری مان ، ذرا پہلے آزما لے پَر

مجھے تو اپنے ہی گھر میں کہیں اَماں نہ ملی
بھروسہ کیا میں کروں ''تیسرے طوالے'' پَر

دُعائیں کر چکے ، کوشش تمام کر بیٹھے
ہماری نظریں ہیں اب آسمان والے پَر

گزشتہ شب مرے آنگن میں چاندنی اُتری
گزشتہ شب ہی تری یاد نے نکالے پَر

شبہ طراز

بلیک ہول میں پڑے لوگ

اِن کی تعداد
مسلسل
بڑھتی جا رہی ہے
یہ رمز
ابھی تک تحقیق طلب ہے
کہ
وہ زندہ کیسے ہیں؟
زندگی
اگر نعمت ہے
تو
اِن کے لیے
جہنم کدہ کیوں ہے
انھیں کب تلک
بے خبری کے برزخ میں
جبر کی کال کوٹھری میں
قید
رکھا جائے گا
وہ صبح
کب طلوع ہوگی؟
جس دن
وہ آزادی سے
اپنی تقدیر خود لکھیں گے
کون ہے
جس نے غلام ابن غلام
ابن غلام کا سکرپٹ لکھ کر
کسی تعویذ کی مانند
اِنھیں پہنا دیا ہے
بھوک کا بھیڑیا
روزانہ
بے حسی کے قبرستان میں
ان کی ہڈیاں پھینک آتا ہے
ان کے خوابوں کی رنگت سیاہ ہو چکی ہے
اِن کے جسموں سے
منافقت کی بدبو آتی ہے
البتہ
دل کے روشن دان کے قریب
اُمید کی ایک چڑیا رہتی ہے
جس کے پر کاٹے جا چکے ہیں

امجد بابر

رفتگاں سے گفتگو

اب اُن گھروں میں جہاں پر کوئی نہیں رہتا
ہَوائیں چیختی پھرتی ہیں خالی کمروں میں
برائے نام عمارت ہے ٹوٹے خوابوں کی
ہر اک طرف ہے صداؤں کی بازگشت جہاں
وہاں پہ رفتگاں کی یاد کا بسیرا ہے
مَیں شام ہوتے ہی کرتا ہوں گفتگو اُن سے
مہک رہے ہیں در و بام جن کی خوشبو سے

میں اُن سے کہتا ہوں سُونا ہے گھر تمہارے بغیر
مجھے وہ کہتے ہیں ایسا کبھی تو ہونا تھا
میں کہتا ہوں کہ تنہی سے تھی زندگی میری
وہ کہتے ہیں کہ تمہیں زندگی گزارنی ہے
میں کہتا ہوں کہ کہیں راستا نہیں ملتا
وہ کہتے ہیں کہ سبھی راستے تمہارے ہیں
میں کہتا ہوں مجھے تنہائی مار ڈالے گی
وہ کہتے ہیں کہ جدائی میں ایسا ہوتا ہے
میں کہتا ہوں مجھے اپنے پرائے چھوڑ گئے
وہ کہتے ہیں کہ کوئی مستقل نہیں رہتا

اِنہی سوالوں جوابوں میں رات کٹتی ہے
میں آنکھ کھول کے دیکھوں تو بات کٹتی ہے

ظہور چوہان

ہم کبوتر بننے میں دیر نہیں لگاتے

ہم اپنی آنکھیں گروی رکھ کے
اجالوں کی تلاش میں نکلے ہوئے جری ہیں
دشمن ہمارے دماغ سے کھیلتا ہے
اور ہم اس کے دھوکے سے

دھوکا خوب صورت ہو تو ہم کبوتر بننے میں دیر
نہیں لگاتے
نقصان چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو
پرسکون رہتے ہیں
ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح

مہربان نیند غیر محسوس طریقے سے ہمارا جسم
سہلاتی ہے
ہمارے خواب مضبوط تسموں سے بندھے
ہوئے بے بسی سے ہمیں دیکھتے ہیں

ہم دشمن کی جنگ تن دہی سے لڑ رہے ہیں
ہمارے ہاتھ میں جیت کی سرخ لکیر سر اٹھا
رہی ہے
عنقریب
دشمن ہماری فتح کا جشن منائے گا

شبیر ناز ش

”قلم سے تیرا رشتہ ہے“ [نثار ترابی کے لیے]

غزل کی چند خوشبوئیں ہوا کے ہاتھ تھامے
روشنی کے پیرہن پہنے
فضا میں گیت گاتی جارہی ہیں
ذرا دیکھو کہ ان کی پتلیوں میں
لفظ و معنی کی سحر کا نور جھلکا ہے
جو موتی بن کے چھلکا ہے
تو اس میں فکر نے تیرے
دکھوں کی اک دھنک تحریر کر دی ہے
تری تصویر بھرتی ہے
تری تصویر ہی تیرے تخیل کا وہ موتی ہے
جسے ارض و سماوات سخن نے آپ پہنا ہے
یہی نایاب گہنا ہے
جو تیری شاعری کی مرمری مالا میں سجتا ہے
تو دنیا بھر میں خوشیوں کا سریلا ساز بجتا ہے
ترے سر پر سخن کا تاج سجتا ہے
فضا نغمہ سرا ہو کر
کسی رجحان سازی کے عمل میں جب بکھرتی ہے
تری تخلیق کی رنگت نکھرتی ہے
نکھرتا رنگ لوح دل پہ تیرا نام لکھتا ہے
قلم سے تیرا رشتہ ہے

عارف فرہاد

نثری نظم

تمہارے اور میرے درمیان
فاصلوں کی خلیج حائل ہے
اسے پاٹنا میرے تو بس میں نہیں

بدگمانی یوں تمہارے وجود کو
حصار میں لئے بیٹھی ہے
کہ تمہیں مجھ میں فقط negativity
دکھتی ہے

تم سے بات کرتے سمے
میرے لفظ کہیں کھو جاتے ہیں
وقت کی تقسیم کرتے ہوئے
تم نے میرے حصے میں صرف انتظار
لکھ دیا ہے

سوچتی ہوں ہم کتنے ambitious
ہو جاتے ہیں
یہ سوچے بنا کہ ننھی منی آنکھوں کے خواب بھی چھوٹے ہوتے ہیں

سفر طے ہونے کا پتا ہی نہیں چلتا
یہاں تک کہ ننھے منے ہاتھ بڑے ہو جاتے ہیں
اور آدرش بلند
پھر ہماری جگہ کہیں باقی نہیں رہتی
وقت کتنا ظالم ہے
اتنی تیزی سے وار کرتا ہے
کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا

ہم تنہا رہ جاتے ہیں

نائلہ راٹھور

نام

غلام مرتضیٰ

بانوے ہی سے ہے، ہو کوئی عَدَد ناموں کا
ایک سر چشمہ "مُحَمَّدؐ" تا اَبَد ناموں کا
سو ہیں گر اِنس، جُدا شکل، جُدا شخصیت
اپنا اپنا ،مرے دِل! رنگ ہے صَد ناموں کا
نیک ناموں کی گو کثرت ہے ہر اک صفحے پر
اور تاریخ صَحِیفَہ بھی ہے بدناموں کا
ہر بڑے نام کو حَسرت سے میں تکتا ہی رہا
میری پہچان میں حائل تھا حَسَد ناموں کا
کون کہتا ہے کہ 'کیا نام میں رکھا ہے یہاں'
وقت کے بَن میں پھرے دیکھ، اَسَد ناموں کا
پل رہے ہیں کئی ٹھنگنے بھی یہاں ان کے طفیل
کس قَدَر اونچا زَمانے میں ہے قد ناموں کا
مُرتضیٰ! رَسم ہے کھا جائے لَحَد جِسم عَظِیم
قَبر کی حد سے گو باہَر ہے جَسَد ناموں کا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرم نوا رہتے ہیں

امتحانِ عشق میں اب کربلا ممکن نہیں!

اب فراتِ وقت میں کرب و بلا ممکن نہیں
تو، حُسین ابنِ علی پھر دوسرا ممکن نہیں

کربلا سے ہر سفر ہے قتل گاہوں کی طرف
کوفیوں کا کربلا سے رابطہ ممکن نہیں

بادلوں کے دوش پر پلٹا کرے برسوں مگر
پانیوں کے بخت میں وہ قافلہ ممکن نہیں

اس جہاں کے بعد بھی کوئی جہاں ممکن تو ہے
امتحانِ عشق میں اب کربلا ممکن نہیں

حاکم و محکوم سب ابنِ علی کے ساتھ ہیں
اُن کے جیسا دوسرا ہو رہنما، ممکن نہیں

داستانِ کربلا سے وقت پر تحریر ہے
ظلم! تیرے نام کا اب سلسلہ ممکن نہیں

عشق کی سب منزلیں ہیں یہ بشیر احمد حبیب
اس سفر میں تم نہ دیکھو کربلا ممکن نہیں

بشیر احمد حبیب

نیک نامی یہ ہم نہیں لیتے

عاصم بخاری

بعد مرنے کے رشتہ داروں میں
ترکہ بٹنے کی بات آئی تو
لڑتے بھڑتے بھی ہم نے دیکھا ہے
کٹتے مرتے بھی ہم نے دیکھا ہے
اپنے قرضے ادھار وہ جانے
جن سے لینا ہے ان سے لیں گے ہم
بات مسجد پہ دینے کی آئی
سیخ پا ہو گئے سبھی بھائی
مشورے مت ہمیں دیے جائیں
عمر بھر اس نے خود دیا ہوتا
خیر کا کام خود کیا ہوتا
ہم تو پائی بھی اک نہیں دیتے
نیک نامی یہ ہم نہیں لیتے
ایسا کوئی کہیں نہیں ملتا
فتوی مفتی کا ہم دکھاتے ہیں

مسافت

ہر روز صبح سویرے اُٹھ کر
ہاتھ منہ دھو کر
بل کہ پورا تیار ہو کر
سلامتی کی دعائیں پڑھتا ہوا
سفر پر نکل پڑتا ہوں

راستہ بہت آسان ہے مگر
دل بے چین ہے
انجان چہروں سے پریشان ہے
کسی کے پاس ہاتھ نہیں
تو کسی کے پاس پاؤں نہیں
کوئی آنکھوں سے محروم ہے
تو کوئی ذہنی مریض ہے
اور کوئی.....لاپروا ہے
مگر ان سب کو یہ سہولت حاصل ہے کہ انھیں
اس سارے میں کوئی بوجھ نہیں اُٹھانا
لیکن یہ بھی طے ہے کہ
ہر لحظہ ہاتھ پاؤں چلاتے رہنا ہے
کہ یہی مسلسل سفر میں ہونے کی نشانی ہے
دماغ پُرسکون ہے
جیسے اسے یقین ہو کہ
یہ مسافت
محض پانچ منٹ بعد
ختم ہونے والی ہے

محمد عبداللہ

”دیپ“

کبھی ہو سکے تو
دیکھو
میری آنکھوں میں
آج بھی
تمھاری یاد
اور
تمھارے انتظار
کے دیپ
روشن ہیں

خیال

گرمیوں کے موسم
کی
ایک مہکی شام کو
موتیے کے گجرے بناتے بناتے
مجھے
تمھارا
خیال آ گیا

نگہت اکرم

نظمیں

اعجاز رضوی

غمگسار

جب بھی سوچا کہ میں اکیلا ہوں
میرے کمرے نے مجھ سے باتیں کیں
بڑھ کے دیواروں نے لگایا گلے

.....

کاش

تھمتے تھمتے تھم جائے گا اشکوں کا سیلاب
رکتے رکتے رک جائے گا جذبوں کا طوفان
مٹتے مٹتے مٹ جائے گی تیری ہر اک بات

.....

ٹوٹی ہوئی بات

یوں تو باتیں کرنے میں کچھ دیر نہیں لگتی ہے
بعض دفعہ اک بات میں ساری عمر گزر جاتی ہے
پھر بھی منہ کی بات اُدھوری رہ جاتی ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جلدی نہ کر، نظر سے اتر، دیکھ بھال کر،
کہسار کے فراز کے نیچے سنبھل کے آ

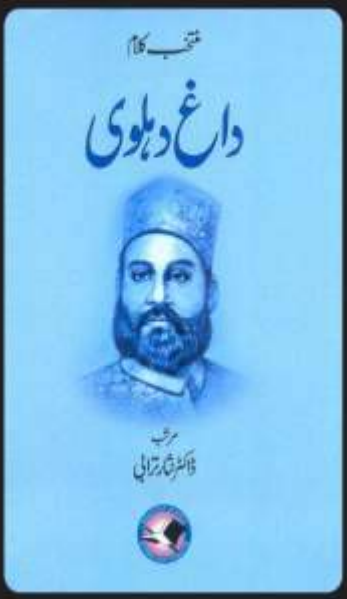

منتخب کلام
داغ دہلوی
مرتب

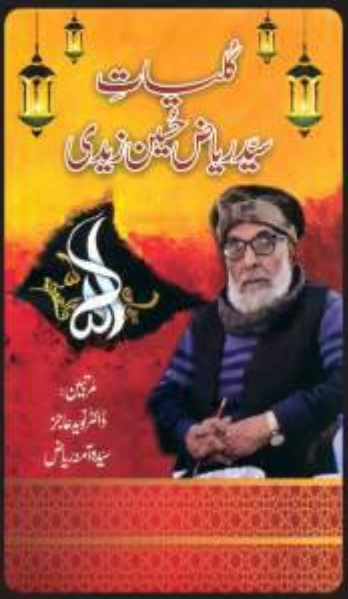

کلیات
سید ریاض حسین زیدی
مرتبین

اردو غزل کے
عصری رویے

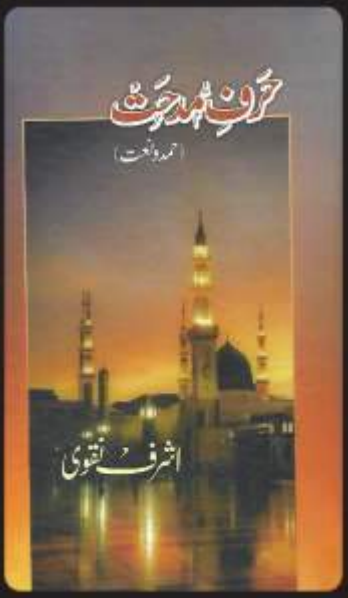

حرفِ مدحت
(حمد و نعت)
اشرف نقوی

منہاج یونیورسٹی لاہور حسان بن ثابت فار ریسرچ ان نعت لٹریچر کی جانب سے خالد احمد کی یاد میں ایک تقریب